

مرا رونا نہیں رونا ہے یہ سارے گلستان کا



# ہماری تباہی کی داستان خونچکاں

یہ اس داستان کا حصہ اول ہے جسے پرویز صاحب نے ۱۹۷۵ء کی طلوع اسلام کنونشن میں اس عنوان کے ساتھ پیش کیا تھا کہ — وہ ہمارا خواب تھا یہ خواب کی تعبیر ہے۔ ۱۹۷۵ء کے بعد اس داستان کا دوسرا حصہ ہو گا لیکن اس کے لئے ہم نے جب بھی اس جگہ فکار اور غمگسار اُمت مرحومہ سے درخواست کی اس نے یہ کہہ کر معذرت چاہی کہ ابھی اس کی ہمت نہیں پڑتی۔

کس قیامت سے شب بھر مری گزری ہے

کہیں میری شب بھبراں کی سحر ہو تو کہوں !

سو اُس "سحر" کا ہم بھی انتظار کرتے ہیں آپ بھی انتظار کریں۔ (طلوع اسلام)



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

# ہماری تنہائی کی داستان نونچال

(حصہ اول۔ ۱۹۷۵ء تک)



(پروفیز صاحب ان چند رقتیہ حیات) مستقبل میں سے ہیں جنہوں نے مطالبہ اور حصول پاکستان کی تانبہ آرزوؤں کا خواب اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اور اس کے بعد انہی آنکھوں سے ان آرزوؤں کو پامال ہوتا دیکھ رہے ہیں۔ اس سے ان کے دل پر کیا گز رہی ہے اس کا اندازہ تو وہی لگا سکتے ہیں البتہ ان کے اس قلبی درد و کرب کا کسی حد تک اظہار ان کی تحریروں اور تقریروں کے ذریعے ہو جاتا ہے۔ اسی درد سے مجبور ہو کر انہوں نے طلوع اسلام کنڈیشن (۱۹۷۵ء) میں..... ایک خطاب پیش کیا تھا جس میں (یوں کہتے ہیں) تحریک پاکستان..... اور مملکت پاکستان کی ساری تاریخ سہٹ کر آگئی تھی۔ مدت کے سینے ان رخصوں کو تازہ رکھنے کے لئے ہم اس خطاب کو (بہ تغیر) دوبارہ شائع کرتے ہیں۔ یہ ۱۹۷۵ء کی بات ہے۔ اس میں چار سال کا اضافہ آپ خود..... کر لیجئے۔)

(۰)

## خطاب

ملت اسلام کے ایک عظیم مفکر نے جس نے اپنے آپ کو سچا طور پر دیہہ بینائے قوم کہا تھا ایک نہایت حسین خواب دیکھا، جسے اس نے ۱۹۳۱ء میں الہ آباد کے مقام پر ان الفاظ میں اپنی قوم ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کے سامنے پیش کر دیا کہ

ہندوستان دنیا بھر میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک علاقہ میں مرکوز کر دیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام، خدا اور بندے کے درمیان ایک روحانی تعلق کا نام نہیں، یہ ایک نظام حکومت ہے۔

اس نظام کا تعین اس وقت ہو چکا تھا جب کسی روسو کے دل میں ایسے نظام کا خیال تک بھی نہیں آیا تھا..... اس کی صحیح قدر و قیمت اس وقت معلوم ہوتی ہے جب وہ ایک معاشرتی نظام کی مشینری میں اپنی جگہ فٹ ہو۔ (اور یہ چیز اپنی آزاد مملکت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی)۔ اس لئے میری آرزو یہ ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد اسلامی ریاست قائم کر دی جائے۔ اس سے اسلام اپنی تعلیم اور ثقافت کو پھر سے زندگی اور حرکت عطا کر سکے گا اور انہیں عصر حاضر کی روح کے قریب تر لانے کے قابل بنا سکے گا۔

(خطبہ صدارت علامہ اقبالؒ، مسلم لیگ سیشن ۱۹۳۰ء)

اس اعلان نے فضا میں تھر تھری پیدا کر دی۔ اس وقت تک اسلام کے متعلق عام طور پر یہی سمجھا جاتا تھا کہ یہ بھی باقی مذاہب کی طرح ایک مذہب ہے۔ اور مذہب کے متعلق تصور یہ تھا کہ وہ خدا اور بندے کے درمیان ایک پراسٹیوٹ روحوانی تعلق کا نام ہے۔ امور مملکت سے اسے کوئی واسطہ نہیں۔ اسلام کے متعلق اس غلط فہمی میں اپنے اور بیگانے، قریب قریب، سبھی مبتلا تھے۔ انہوں نے پہلی بار سنا کہ اسلام اسی صورت میں ایک زندہ حقیقت بن سکتا ہے جب اس کے پیروؤں کی اپنی آزاد مملکت ہو، جس میں وہ اس قابل ہوں کہ آزادانہ اسلام کی ابدی اقتدار پر عمل پیرا ہو سکیں۔ اس وقت غیر منقسم ہندوستان میں آزادی کی تحریک جاری تھی جس سے مراد یہ تھی کہ تمام اقتدار انگریزوں کے ہاتھ سے چھین کر پورے ہندوستان میں ایک آزاد مملکت قائم کر لی جائے۔ اور اس مملکت میں مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل ہو۔ یعنی اسی قسم کے اسلام کی آزادی، جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ آزادی کا یہ تصور عوام ہی کا نہیں تھا۔ مسلمانوں کے بڑے بڑے اکابرین، حتیٰ کہ ان کے علمائے کرام تک اسی کے حامی تھے اور اس آزادی کے حصول کی کوششوں کو جہادِ عظیم کہہ کر بکا رہتے تھے۔ بنا بریں، مسلمانوں کیلئے آزادی کا جو تصور اقبالؒ نے پیش کیا۔ اس کی، اور تو اور، ان علماء کی طرف سے بھی سخت مخالفت ہوئی اور انہی کے ساتھ علامہ اقبالؒ کو سب سے بڑی جنگ کرنی پڑی۔ اس سلسلہ میں ان کا جو معرکہ مولانا حسین احمد مدنیؒ کے ساتھ ہوا، وہ تاریخ کے صفحات میں ایک ابدی حقیقت کے طور پر منضبط ہے۔ مولانا مدنیؒ کا مسلک یہ تھا کہ ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرانے کے بعد وہاں مغربی اندازِ جمہوریت کی حکومت قائم کر دی جائے، جس میں مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل ہو۔ علامہ اقبالؒ کا موقف یہ تھا کہ آزادی کا یہ تصور ہندو کا تو ہو سکتا ہے، مسلمانوں کا نہیں۔ جہانگیر ملک کو انگریزوں کے تسلط سے آزاد کرانے کا سوال ہے، اس میں مسلمان برابر کے شریک ہیں، لیکن ان کے نزدیک یہ آزادی نہیں بلکہ آزادی کے حصول کا ذریعہ یا اس کی منزلِ اول ہے۔ ان کے تصورِ آزادی کی تشکیل اس وقت ہوتی ہے جب انہیں اس امر کی آزادی ہو کہ وہ اپنے اُن اسلامی حکومت قائم کر سکیں۔ اور یہ اسی صورت

## مسلمانوں کی آزادی

میں ممکن ہے جب بلا شرکتِ غیر سے ان کی اپنی جداگانہ مملکت ہو۔ چنانچہ انہوں نے اپنی دنات سے چند ہی ماہ پہلے (سپتمبر ۱۹۳۵ء میں) مولانا مدنیؒ مرحوم کے اعتراض کے جواب میں فرمایا تھا:-

مسلمان ہونے کی حیثیت سے انگریز کی غلامی کے بند توڑنا اور اس کے اقتدار کو ختم کرنا ہمارا فرض ہے۔ لیکن اس آزادی سے ہمارا مقصد یہ نہیں کہ ہم آزاد ہو جائیں بلکہ ہمارا اذلیں مقصد یہ ہے کہ اسلام قائم رہے اور مسلمان طاقتور بن جائیں۔ اس لئے مسلمان کسی ایسی حکومت کے قیام میں مددگار نہیں ہو سکتا جس کی بنیادیں انہی اصولوں پر ہوں جن پر انگریزی حکومت قائم ہے۔ ایک باطل کو مٹا کر دوسرے باطل کو قائم کرنا، چہ معنی دار و نہ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کلیتہً نہیں تو ایک بڑی حد تک دارالاسلام بن جائے۔ لیکن اگر آزادی ہند کا نفع یہ ہو کہ جیسا دارالکفر اب ہے ویسا ہی رہے، یا اس سے بھی بدتر بن جائے تو مسلمان ایسی آزادی وطن پر ہزار لعنت بھیجتا ہے۔ میں ایسی آزادی کی راہ میں، لکھنا، بولنا، روپیہ صرف کرنا، لاکھیاں کھانا، جیل جانا، گولی کا نشانہ بننا، سب حرام سمجھتا ہوں۔ قطعاً حرام۔

(علامہ اقبالؒ کا بیان موسوم بہ "معرکہ دین و وطن")

نیشنلسٹ علماء کا یہ نظریہ بھی تھا کہ ایک وطن کی حدود کے اندر بسنے والے تمام لوگ بلا تفریق مذہب و ملت ایک قوم کے افراد ہوتے ہیں۔ اور یہی وہ قوم ہے جس کی مشترکہ حکومت اس ملک میں قائم ہوتی ہے۔ اس نظریہ کی بنا پر ہندوستان میں بسنے والے مسلمان ہندوستانی قوم کے اجزاء ہیں اور اس لئے ان کی جداگانہ مملکت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے جواب میں علامہ اقبالؒ نے کہا کہ قومیت کا یہ نظریہ بھی سراسر باطل اور قرآنی نظریہ قومیت کے خلاف ہے۔ قرآن کی رو سے قومیت کا معیار دین کا اشتراک ہے نہ کہ وطن کا۔ اس لئے کسی ملک کے اندر رہنے والے مسلمان محض اشتراک وطن کی بنا پر وطن کی عزیز مسلم آبادی سے مل کر ایک قوم نہیں بن سکتے۔ مسلمان ایک جداگانہ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں، اور اس بنا پر بھی اپنی الگ مملکت قائم کرنے کے حقدار ہیں۔ انہوں نے مولانا حسین احمد مدنیؒ کے جواب میں کہا کہ:

### اسلامی نظریہ قومیت

اگر وطنیت کا جذبہ ایسا ہی اہم اور قابلِ فخر تھا تو رسول اللہ ﷺ کے بعض اقارب، ہم نسلوں اور ہم قوموں کو، آپ سے پر خائیاں کیوں ہوئی۔ کیوں نہ رسول اللہ ﷺ نے اسلام کو محض ایک ہمہ گیر ملت سمجھ کر بلحاظ قوم یا قوم ابو جہل اور ابولہب کو اپناٹے رکھا اور ان کی دلجوئی کرتے رہے۔ بلکہ کیوں نہ عرب کے سیاسی اور دینی ان کے ساتھ قومیت وطنی قائم رکھی۔ . . . . محمدؐ (فدا ابی و اُمّی) کی قوم آپ کی بعثت سے پہلے ایک قوم تھی اور آزاد تھی۔ لیکن جب محمدؐ کی امت بننے لگی تو اب قوم کی حیثیت ثانوی رہ گئی جو لوگ رسول اللہ ﷺ کی متابعت میں آگئے وہ خواہ ان کی قوم میں سے تھے یا دیگر اقوام کے، وہ سب امت مسلمہ یا ملت محمدیہ بن گئے۔ پہلے وہ ملک و نسب کے گرفتار تھے۔ اب ملک و نسب ان کا گرفتار نہ ہو گیا۔ . . . . حضور ﷺ رسالتِ مآب کے لئے یہ راہ بہت آسان تھی کہ آپ ابولہب یا ابو جہل یا کفار مکہ سے یہ فرماتے کہ تم اپنی نسبت پرستی پر قائم رہو، ہم اپنی خدا پرستی پر قائم رہتے ہیں۔ مگر اس نسلی اور وطنی اشتراک کی بنا پر جو ہمارے اور تمہارے درمیان موجود ہے، ایک وحدتِ عربیہ قائم کی جا

سکتی ہے۔ لیکن حضور (ﷺ) اگر یہ راہ اختیار کرتے تو اس میں شک نہیں کہ یہ ایک وطن دوست کی راہ ہوتی۔ (معکرہ دین و وطن)

علامہ اقبالؒ نے اس حقیقت کو بھی متعدد بار واضح کر دیا کہ ہم جو کہتے ہیں کہ اسلام میں قومیت کا مدار دین کا اشتراک ہے نہ کہ وطن کا، اور یہ کہ اسلام ایک زندہ حقیقت صرف اسی صورت میں بن سکتا ہے، جب اس کی اپنی آزاد مملکت ہو، تو کوئی شخص اس زعم باطل میں گرفتار نہ رہے کہ ہم ان نظریات کو محض حصول اقتدار کے لئے بطور حربہ استعمال کر رہے ہیں۔ یہ ہمارے دین کی ابدی اور غیر متغیر حقیقتیں ہیں، جنہیں بدقسمتی سے مسلمانوں نے فراموش کر دیا تھا۔۔۔۔۔ میں انہی کی یاد دہانی کر رہا ہوں۔ اسی بنا پر انہوں نے فرمایا۔ اگر بعض مسلمان اس فریب میں مبتلا ہیں کہ دین اور وطن بحیثیت ایک سیاسی تصور کے یکجا رہ سکتے ہیں تو میں بروقت مسلمانوں کو انتباہ کرتا ہوں کہ اس راہ کا آخری مرحلہ اقل تو لا دینی ہوگا، اور اگر لا دینی نہیں تو اسلام کو محض ایک اخلاقی نظریہ سمجھ کر اس کے اجتماعی نظام سے لاپرواہی۔

(معکرہ دین و وطن)

یہ تھا وہ خواب، جو اس دیدہ و سنے دیکھا، اور اسے دنیا کے سامنے ایسے واشگاف الفاظ میں پیش کیا۔ اقبالؒ اس حقیقت سے بھی نا آشنا نہیں تھا کہ ایک مفکر صحیح نظریات پیش کر سکتا ہے۔ ان نظریات کو عملی پیکروں میں ڈھالنا سیاسی مدبرین کا کام ہوتا ہے۔ بنا بریں انہیں کسی ایسے مدبر کی تلاش تھی جو اس عظیم مقصد کے حصول کا اہل بھی ہو اور انتہائی قابل اعتماد بھی۔ یہ بھی اقبالؒ کے کردار کی عظمت کا ثبوت ہے، ورنہ عام طور پر ہوتا یہی ہے کہ نام نہاد بڑے لوگ، یہ جانتے کے باوجود کہ وہ فلاں کام کے اہل نہیں، محض بڑا بننے کی سوچ میں اس کے ساتھ چپٹے رہنا چاہتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ کو جو عالمگیر شہرت حاصل تھی اور ملت اسلام کے دل میں بالخصوص ان کے لئے جو جذبہ احترام موجزن تھا، اگر وہ بھی اس قسم کی پوزیشن اختیار کر لیتے تو ان پر کوئی بھی معترض نہ ہوتا۔ لیکن ان کے جذبہ میں صداقت تھی، اس لئے انہوں نے ایسا نہیں کیا، اور کسی ایسی شخصیت کو تلاش کرتے رہے جو اس کی اہل ہو۔ اور بالآخر ان کی یہ تلاش کامیاب ہو گئی۔ دنیا

## جناح کو ڈھونڈ نکالا

سیاست کی فراست آج تک عجوبہ حیرت ہے کہ اس تلاش میں ان کی نگاہ جا کر ملکی تو کس شخصیت پر۔۔۔۔۔ اس شخصیت پر جس کے متعلق اس وقت کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ ایمان کی بنیادوں پر جداگانہ قومیت اور اسلام کے احیاء کے لئے مسلمانوں کی جداگانہ مملکت کے نظریہ کو اپنا سکے گا، اور نہ صرف اپنا سکے گا، بلکہ اُسے کامیابی کی آخری منزل تک بھی پہنچا دے گا۔ بمبئی کے پیرسٹر مسٹر محمد علی جناحؒ بہت بڑے نیشنلسٹ تھے۔ عمر بھر ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار رہے، اور جب اپنی کوششوں میں ناکام رہ گئے تو مایوسی کے عالم میں وطن کو چھوڑ کر سات سمندر پار انگلستان کے ایک گوشہ تنہائی میں خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔ علامہ اقبالؒ کی نگاہ متجسس جا کر اس شخصیت پر ملکی۔۔۔ چنانچہ انہوں نے مسٹر جناحؒ سے رابطہ قائم کیا اور ایک عرصہ کی جدوجہد کے بعد ۲۱ جون ۱۹۴۷ء کو انہیں وہ خط لکھا جو ان کے ترکش کا آخری تیر تھا۔ وہ تیر ٹھیک نشانہ پر بیٹھا۔ اس خط میں

انہوں نے لکھا تھا کہ:-

میں جانتا ہوں کہ آپ بہت بڑے مصروف انسان ہیں۔ لیکن مجھے امید ہے کہ میرا آپ کو بار بار لکھنا آپ پر گراں نہیں گذرتا ہوگا۔ (میرے اس اصرار و نکرار کی وجہ سے کہ) میری نگاہ میں اس وقت ہندوستان بھر میں آپ ہی وہ واحد مسلمان ہیں جس کے ساتھ ملت اسلام کو اپنی یہ امیدیں وابستہ کرنے کا حق ہے کہ آپ اس طوفان میں، جو یہاں آنے والا ہے، اس کی کشتی کو ثابت و سالم، بہ امن و عافیت، ساحلِ مراد تک پہنچائیں گے۔

(قائد اعظمؒ کی سوانح عمری - مؤلفہ میکٹر پریلیمنڈ - صفحہ ۱۱۵)

یہ تیرا قبائل کے قلب سے نکلا اور سیدھا جناحؒ کے دل میں پیر گیا۔ اقبالؒ نے پورے اعتماد اور یقین کے ساتھ قرآنِ نظریات کی یہ شمع فروزاں جناحؒ کے ہاتھ میں تھا دی جسے ملت نے بجا طور پر "قائد اعظمؒ" کہہ کر پکارا۔ اقبالؒ کے بعد دین اور وطن کی یہ جنگ، قائد اعظمؒ اور تحریک پاکستان کے مخالفین کے درمیان ٹھٹھ گئی۔ ان میں انگریز، ہندو، کانگریسی مسلمان، سیاسی لیڈر اور نیشنلسٹ علماء سب شامل تھے۔ اور مسٹر گاندھی اس زمانہ میں اس متحدہ محاذ کا سربراہ تھا۔ مسٹر گاندھی نے قائد اعظمؒ کو لکھا کہ آپ دین کو قومیت کا معیار کیسے قرار دیتے ہیں اور مذہب کو سیاست میں کیوں گھسیٹ رہے ہیں۔ اس کے جواب میں قائد اعظمؒ نے اسے یکم جنوری ۱۹۴۷ء کو ایک خط لکھا جس میں کہا کہ

آج آپ اس سے انکار کرتے ہیں کہ قومیت کی تشکیل میں مذہب ایک بہت بڑا عنصر ہے۔ لیکن جب خود آپ سے یہ سوال کیا گیا تھا کہ زندگی میں آپ کا مقصود کیا ہے اور وہ کونسی قوت محرکہ ہے جو ہمیں آمادہ بہ عمل کرتی ہے۔ کیا وہ مذہب ہے یا سیاست؟ یا عمرانی اصلاح، تو آپ نے کہا تھا کہ وہ خالص مذہبی جذبہ ہے۔ لہذا مذہب اور سیاست دو الگ الگ شعبے ہو نہیں سکتے۔ آپ تمدنی، معاشی، سیاسی اور خالص مذہبی امور کو الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر ہی نہیں سکتے۔ جس مذہب کو نوع انسان سے واسطہ نہیں، میں اسے مذہب ہی تسلیم نہیں کرتا۔ مذہب انسان کے ہر معاملہ کے لئے اخلاقی بنیاد بنیاد کرتا ہے۔ اگر مذہب نہ ہو تو انسانی اعمال اس بنیاد سے محروم رہ جاتے ہیں، اور جب زندگی ایسی بنیاد سے محروم رہ جائے تو وہ انسانی زندگی نہیں، محض عوفا آرائی اور ہنگامہ پروری بن کر رہ جاتی ہے۔ جس میں شور و شغب تو بہت ہوتا ہے، لیکن مقصد کچھ نہیں ہوتا۔

تقاریر جناحؒ - جلد اول - صفحہ ۲۰، ۱۳۹

جہاں تک دو قومی نظریہ کا تعلق ہے، انہوں نے مسلم لیگ کے مدراس سیشن (۱۹۴۶ء) کے خطبہ صدارت میں فرمایا:-

مسلم لیگ کا نصب العین یہ بنیادی اصول ہے کہ ہندوستان کے مسلمان ایک جداگانہ قومیت رکھتے ہیں۔ انہیں کسی دوسری قوم میں جذب کرنے یا ان کے نظریات اور ملی تشخص کو مٹانے کے لئے جو کوشش



کی جائے گی، اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے گا۔۔۔۔۔ ہم نے تہیہ کر لیا ہے کہ ہم نے اپنے جداگانہ قومی تشخص اور جداگانہ مملکت کو قائم کر کے رہنا ہے۔ اس باب میں کسی کو، کسی قسم کی غلط فہمی میں مبتلا نہیں رہنا چاہیے۔ (ایضاً - صفحہ ۲۸۰)

مسٹر گاندھی نے انہیں ایک خط میں لکھا کہ

میں تاریخ میں اس کی مثال نہیں پاتا کہ کچھ لوگ، جنہوں نے اپنے آباؤ اجداد کا مذہب پھوڑ کر ایک نیا مذہب قبول کر لیا ہو، وہ اور ان کی اولاد یہ طوطی کریں کہ وہ اپنے آباؤ اجداد سے الگ قوم بن گئے ہیں۔ اگر ہندوستان اسلام کی آمد سے پہلے ایک قوم تھا تو اسلام کے بعد بھی اسے ایک قوم ہی رہنا چاہیے۔ خواہ اس کے سپوتوں میں سے ایک کثیر تعداد نے اسلام قبول کر لیا ہو۔

(مکتوب مورخہ ۱۵ ستمبر ۱۹۴۵ء)

اسی قسم کے تھے وہ اعتراضات، جن کے پیش نظر قائد اعظمؒ نے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس ۱۹۴۰ء کے خطبہء صدارت میں فرمایا تھا کہ

میرے لئے یہ اندازہ لگانا بہت مشکل ہے کہ آخر ہمارے ہندو بھائی، اسلام اور ہندو مت کی حقیقت اور اصلیت کو سمجھنے سے کیوں گریز کرتے ہیں۔۔۔۔۔ یہ حقیقت ہے کہ دونوں مذہب نہیں ہیں، بلکہ ایک دوسرے سے مختلف معاشرتی نظام ہیں اور اس بنا پر متحدہ قومیت ایک ایسا خواب ہے جو کبھی شرمندہٴ تغیر نہیں ہو سکتا۔ یاد رکھئے! ہندو اور مسلمان زندگی کے ہر معاملہ میں جداگانہ فلسفے رکھتے ہیں۔ دونوں کی معاشرت ایک دوسرے سے مختلف ہے۔۔۔۔۔ یہ دو الگ الگ تہذیبوں سے تعلق رکھتے ہیں، جن کی بنیادیں متضاد تصورات پر قائم ہیں۔ وہ ایسی قوموں کا ایک نظام حکومت میں جکڑ دینا، باہمی مناقشت کو بڑھائے گا اور بالآخر اس نظام کو پاش پاش کر دے گا جو اس ملک کے لئے وضع کیا گیا ہو۔

(نفاذ پر جناحؒ - جلد اول - صفحہ ۱۷۸-۱۷۷)

ہم شروع میں دیکھ چکے ہیں کہ جب علامہ اقبالؒ نے پاکستان کا تصور پیش کیا تھا تو انہوں نے اس امر کی وضاحت کر دی تھی کہ اس سے اتنا ہی مقصد نہیں کہ ہمیں ایک خطہٴ زمینی مل جائے جس میں ہم اپنی آزاد مملکت قائم کر لیں۔ اس سے حقیقی مقصد یہ ہے کہ ایک ایسی مملکت وجود میں آجائے، جس میں اسلام پھر وہی زندہ حقیقت بن جائے، جس میں وہ صدر اول میں بنا تھا۔ قائد اعظمؒ بھی، جہاں غیروں کے ساتھ جو کبھی ٹرائل دیتے تھے، خود اپنی قوم کے دل میں اس حقیقت کو راسخ کئے جاتے تھے کہ اس جدوجہد سے مقصود دنیا کی اور قوموں کی طرح ایک آزاد مملکت قائم کرنا نہیں۔ بلکہ اس سے مقصود اسلام کا احیاء ہے جو اپنی مملکت کے بغیر ممکن نہیں۔ مثلاً انہوں نے ۱۰ مارچ ۱۹۴۱ء کو مسلم یونیورسٹی یونین، علی گڑھ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:-

اگر آپ چاہتے ہیں کہ اس ملک سے اسلام کا نام و نشان نہ مٹ جائے تو اس کے لئے پاکستان

نہ صرف یہ کہ ایک علیٰ نصب العین ہے، بلکہ یہی اور صرف یہی واحد نصب العین ہے۔

(ایضاً - صفحہ ۲۶)

اُن کے نزدیک اس مقصد اور نصب العین کی کس قدر اہمیت تھی، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ انہوں نے ۲۳ مارچ ۱۹۴۵ء کو پاکستان طے کی تقریب پر پیغام دیتے ہوئے کہا۔

ہماری حفاظت، نجات اور عزت و آبرو (کے تحفظ کا واحد ذریعہ) پاکستان ہے۔ اگر ہم اس جدوجہد میں ناکام رہ گئے تو، ہم تو تباہ ہو ہی جائیں گے، لیکن اس کے ساتھ ہی اس برصغیر میں نہ مسلمانوں کا وجود باقی رہے گا، نہ اسلام کا نام و نشان۔

(تقاریر جناحؒ - جلد دوم - صفحہ ۲۵۵)

اس سے آپ اندازہ لگائیے کہ اُن کے نزدیک مملکت پاکستان کا مقصد کیا تھا اور اس کی اہمیت کس قدر۔ فریق مخالف تو ایک طرف، اُن سے خود، ان کے رفقاء بھی نہ رہ کر پوچھتے کہ مسلمانوں میں اس وقت اس قدر اختلافات ہیں۔ یہ انہیں مثاکر کس طرح ایک امت واحدہ کے قالب میں ڈھل جائیں گے؟ اس کے جواب میں انہوں نے ۱۳ نومبر ۱۹۴۵ء کو پیغام عید کی نشری تقریر میں فرمایا کہ:-

جب ہمارے پاس قرآن کریم ایسی مشعلِ ہدایت موجود ہے تو پھر ہم اس کی روشنی میں ان اختلافات کو کیوں نہیں مٹا سکیں گے۔

(تقاریر جناحؒ - جلد اول - صفحہ ۱۰۸)

انہوں نے کراچی مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ دسمبر ۱۹۴۳ء میں اس اجمال کی تفصیل بڑے بلیغ انداز میں فرمائی۔ انہوں نے پہلے خود ہی یہ سوال اٹھایا کہ:-

وہ کونسا رشتہ ہے جس سے منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسد واحد کی طرح ہیں۔ وہ کونسی چٹان ہے جس پر ان کی ملت کی عمارت استوار ہے۔ وہ کونسا سنگر ہے جس سے اس امت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے۔۔۔۔۔؟

اس کے بعد خود ہی ان سوالات کا جواب ان الفاظ میں دیا:-

وہ بندھن، وہ رشتہ، وہ چٹان، وہ سنگر، خدا کی کتاب عظیم قرآن مجید ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے، ہم میں زیادہ سے زیادہ وحدت پیدا ہوتی جائے گی۔ ایک خدا، ایک کتاب، ایک رسولؐ، لہذا ایک قوم۔

(تقاریر جناحؒ - جلد دوم - صفحہ ۵۰)

اس سے آپ نے دیکھا کہ قائد اعظمؒ کے نزدیک بھی نہ صرف یہ کہ مسلمان ایمان کے اشتراک کی بنیاد پر غیر مسلموں کے مقابلہ میں ایک جداگانہ قوم کی حیثیت رکھتے تھے، بلکہ خود مسلمانوں کے اندر بھی اتحاد ہی نہیں بلکہ وحدت کا بھی یہی ذریعہ تھا۔ اور یہی اسلام کا بھی مقصد ہے۔ انہوں نے ان تمام حقائق کو ایک مقام پر اس حسن و خوبی سے یکجا کر دیا کہ ہم سمجھتے ہیں کہ اسے مملکت پاکستان کے آئین کی بنیاد کہنا بے جا نہ ہوگا۔ ہوا یہ کہ قائد اعظمؒ ۱۹ اگست ۱۹۴۷ء کو حیدر آباد دکن تشریف لے گئے۔ وہاں بعض نوجوان طلباء نے ان سے کچھ سوالات کئے۔ اس مکالمہ کو



مسٹر محمود علی، بی ایس (عثمانیہ) نے محفوظ کر لیا۔ اور بینٹ پریس کی وساطت سے یہ اخبارات میں شائع ہوا اور طلوع اسلام نے اسے مارچ ۱۹۷۲ء کے پرچہ میں شائع کیا۔ یہ انٹرویو بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اس قابل ہے کہ اسے بار بار سامنے لایا جائے۔ آپ بھی توجہ سے سنیے۔

## اسلامی مملکت کا امتیاز خصوصی

سوال :- مذہب اور مذہبی حکومت کے موازنہ کیا ہیں ؟  
جواب :- جب میں انگریزی زبان میں مذہب کا لفظ سنا ہوں تو اس زبان اور قوم کے محاورہ کے مطابق لامحالہ میرا ذہن خدا اور بندے کی باہمی نسبت اور رابطہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن میں بخوبی جانتا ہوں کہ اسلام اور مسلمانوں کے نزدیک مذہب کا یہ محدود اور مقید مفہوم یا تصور نہیں ہے۔ میں نہ تو کوئی مولوی ہوں، نہ مغل۔ نہ مجھے دینیات میں جہارت کا دعویٰ ہے۔ البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانین اسلامیہ کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو، معاشرتی، سیاسی، سوداگشی، خزانہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطے سے باہر ہو۔ قرآن کریم کی اصولی ہدایات اور سیاسی طریق کار نہ صرف مسلمانوں کے لئے بہترین ہیں بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لئے حسن سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصہ ہے، اس سے بہتر تصور ناممکن ہے۔

سوال :- اس سلسلہ میں اشتراکی حکومت وغیرہ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے ؟  
جواب :- اشتراکیت، بالخصوص یا دیگر اسی قسم کے سیاسی اور معاشی مملکت، راجل اسلام اور اس کے نظام سیاست کی غیر مکمل اور بھونڈی سی نقلیں ہیں۔ ان میں اسلامی نظام کے اجزاء کا سا رابطہ اور تناسب و توازن نہیں پایا جاتا۔

سوال :- ترکی حکومت تو ایک مادی حکومت (سیکیولر اسٹیٹ) ہے۔ کیا اس سے اسلامی حکومت مختلف ہے ؟ آپ کا اس باب میں کیا خیال ہے ؟

جواب :- میرے خیال میں ترکی حکومت پر مادی حکومت کی سیاسی اصطلاح اپنے پورے مفہوم میں منطبق نہیں ہوتی۔ اب رہا اسلامی حکومت کے تصور کا امتیاز، سو یہ بالکل واضح ہے اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز پیش نظر رہنا چاہئے کہ اس میں اطاعت اور وفا کیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے۔ جس کے لئے تعجیل کا واحد ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلانہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ کسی پارلیمنٹ کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے۔ اور حکمرانی کے لئے آپ کو علامہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔

سوال :- وہ مملکت ہیں ہندوستان میں کس طرح نصیب ہو سکتی ہے؟  
جواب :- مسلم لیگ، اس کی تنظیم، اس کی جدوجہد، اس کا رخ، اس کی راہ، سب اس سوال کے جواب ہیں۔

سوال :- جب آپ اسلامی اصول کے نصب العین اور طریق کار دونوں میں بہترین حکومت کا یقین رکھتے ہیں اور اجمالاً یہ بھی کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو خود مختار علاقے اس لئے مطلوب ہیں کہ وہاں وہ اپنے ذہنی میلانات اور تصورات زندگی کو بلا روک ٹوک بروئے کار اور رو بہ ترقی لاسکیں، تو پھر اس میں کونسا امر مانع ہے کہ مسلم لیگ زیادہ تفصیل اور توضیح کے ساتھ اپنی جدوجہد کی مذہبی تعبیر و تشریح کر دے؟

جواب :- وقت یہ ہے کہ جب اس جدوجہد کو مذہب سے تعبیر کیجئے تو ہمارے علماء کی ایک جماعت بغیر اس بات کے سمجھنے کے کہ کام کی نوعیت، تقسیم عمل اور اس کے اصلی حدود کیا ہیں، ان امور کو صرف چند مولویوں کا اجارہ خیال کر لیتی ہے، اور اپنے حلقہ سے باہر اہمیت اور استعداد کے باوجود مجھ میں یا آپ میں (یعنی ان کے اپنے سوا کسی اور میں) اس خدمت کے سرانجام دینے کی کوئی صورت نہیں دیکھتی۔ حالانکہ اس منصب کی بجا آوری کے لئے جن اجتہادی صلاحیتوں کی ضرورت ہے، انہیں ہیں، ان مولوی صاحبان میں (اللہ ماشاء اللہ) نہیں پاتا۔ (اور مشکل اندر مشکل یہ کہ وہ اس مشن کی تکمیل میں دوسروں کی صلاحیتوں سے کام لینے کا سلیقہ بھی نہیں رکھتے۔

آپ اس مکالمہ کے ایک ایک لفظ پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ قائد اعظمؒ کے تصور میں اُس پاکستان کا کیا نقشہ تھا، جس کے لئے وہ اس قدر توجہ دی اور جانفشانی سے مصروف کار تھے۔ اُسی زمانہ میں یہ سوال بھی پیدا ہوا کہ جب بقول قائد اعظمؒ، مولوی صاحبان میں نہ اس کی صلاحیت تھی، نہ اس کی استعداد کہ وہ امور مملکت کو سمجھ بھی سکیں تو پھر ان کے ذہن میں وہ کونسا طریق تھا جس سے وہ اس مملکت کو حقیقی معنوں میں اسلامی بنانا چاہتے تھے۔ اس سوال کا اجمالی جواب تو خود اس انٹرویو کے ایک ایک فقرہ کے اندر موجود ہے۔ یعنی یہ کہ اس میں قرآن کریم کے احکام ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کریں گے۔ لیکن اس کی تفصیل انہوں نے کئی دیگر مقامات پر بھی بتائی۔ مثلاً ۱۹۴۵ء میں ملت کے نام، عید کے پیغام میں اس کی وضاحت ان الفاظ میں فرمائی :-

اس حقیقت سے ہر مسلمان واقف ہے کہ قرآن کے احکام، مذہبی اور اخلاقی حدود تک محدود نہیں۔ مشہور سورہ حج کی آیت لکھا ہے کہ ”بحر اطلاق تک سے لے کر گنگا تک ہر جگہ قرآن کو ضابطہ حیات کے طور پر مانا جاتا ہے۔ اس کا تعلق صرف الہیات تک نہیں، بلکہ وہ مسلمانوں کے لئے سہول اور فوجداری قوانین کا ضابطہ ہے جو نوع انسانی کے تمام اعمال و احکام کو محیط ہیں اور جو غیر متبدل، منشاء خداوندی کے مظہر ہیں۔

اس کے بعد قائد اعظمؒ نے کہا :-

اس حقیقت سے سوائے جہلاء کے ہر شخص واقف ہے کہ قرآن کریم مسلمانوں کا بنیادی ضابطہ زندگی ہے جو معاشرت، مذہب، تجارت، عدالت، فرج، دیوانی، فوجداری اور تعزیرات کے ضوابط کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ مذہبی رسوم ہوں یا دوسرے کے معمولات روح کی نجات کا سوال ہو یا بدن کی مصفا کی۔ اجتماعی حقوق کا سوال ہو یا انفرادی واجبات کا۔ عام اخلاقیات ہوں یا جرائم۔ دنیاوی سزا کا سوال ہو یا آخرت کے مواخذہ کا۔ ان سب کے لئے اس میں قوانین موجود ہیں۔ اسی لئے نبی اکرم ﷺ نے حکم دیا تھا کہ ہر مسلمان قرآن کا نسخہ اپنے پاس رکھے اور اس طرح اپنا مذہبی پیشوا آپ بن جائے۔

(تقاریر جناح - جلد دوم - ص ۳۷)

## تھیا کریسی کے خلاف

اس سے واضح ہے کہ قائد اعظم کے تصور میں یہی تھا کہ مملکت پاکستان کا بنیادی دستور قرآن کریم ہوگا۔ اور ملت پاکستانیہ یا مہی مشاوری سے یہ طے کرے گی کہ اس کے اصول و اقدار و احکام کو بحالات موجودہ نافذ کرنے کا کیا طریق ہو۔ اس لئے انہوں نے بار بار اس کی وضاحت کر دی کہ یہاں تھیا کریسی قائم نہیں ہوگی۔ چنانچہ انہوں نے فروری ۱۹۴۷ء میں بحیثیت گورنر جنرل اہل امریکہ کے نام اپنے براؤ کا سٹ میں کہا تھا:-

پاکستان کا نسٹی ٹیوٹ اسمبلی نے ابھی پاکستان کا آئین مرتب کرنا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس آئین کی آخری شکل کیا ہوگی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کا آئینہ دار جمہوری انداز کا ہوگا۔ اسلام کے یہ اصول آج بھی اسی طرح عملی طور پر منطبق ہو سکتے ہیں، جس طرح وہ تیرہ سو سال پہلے ہو سکتے تھے۔ اسلام نے ہمیں وحدت انسانیت اور ہر ایک کے ساتھ عدل و دیانت کی تعلیم دی ہے۔ آئینی پاکستان کے مرتب کرنے کے سلسلہ میں جو ذمہ داریاں اور فرائض ہم پر عائد ہوئے ہیں، ان کا ہم پورا پورا احساس رکھتے ہیں۔ کچھ بھی ہو، یہ مسئلہ بات ہے کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی تھیا کریسی رائج نہیں ہوگی، جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ماتھے میں دی جاتی ہے کہ وہ (بقیہ تعلیم خویش) خدائی مشن کو پورا کریں۔

(تقاریر بحیثیت گورنر جنرل - ص ۶۵)

انہوں نے تحریک پاکستان کے آغاز ہی میں، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی طلباء کی یونین سے (۱۹۳۸ء میں) خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ:

مسلم لیگ نے دو بڑے بڑے کام کئے ہیں۔ ایک، اس نے ہمیں مسلمانوں کے رجعت پسند طبقہ سے آزادی دلا دی ہے اور اس خیال کو عام کر دیا ہے کہ جو لوگ اپنی خود غرضیوں کا کھیل کھیل رہے ہیں، وہ غدار ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ اس نے ہمیں مولوی اور مولاناؤں کے ناخوش آئند مختصر سے نجات دلا دی ہے۔

(تقاریر قائد اعظم - جلد اول - ص ۴۴)

اور علامہ اقبالؒ نے اس سے پہلے (۱۹۳۲ء میں) اپنے ایک بیان میں جو روزنامہ انقلاب (لاہور) کی ۲۳ مارچ ۱۹۳۲ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا، فرمایا تھا:-

تمہارے دین کی یہ عظیم الشان بلند نظری ملاحذ اور فقیہوں کے فرسودہ نظام میں جکڑی ہوئی ہے اور آزادی چاہتی ہے۔ روحانی اعتبار سے ہم حالات و جذبات کے ایک قید خانے میں محبوس ہیں جو صدیوں کی مدت میں ہم نے اپنے گرد خود تعمیر کر لیا ہے اور ہم بوڑھوں کے لئے شرم کا مقام ہے کہ ہم نو جوانوں کو ان کی اقتصادی، سیاسی بلکہ مذہبی بحرانوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ بنا سکے جو زمانہ حاضر میں آنے والے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ساری قوم کی موجودہ ذہنیت کو یکسر تبدیل کر دیا جائے تاکہ وہ پھر نئی آرزوں، نئی تمنائوں، اور نئے نصب العین کی اسنگ کو محسوس کرنے لگے۔

(بحوالہ بلفٹ - فکر اقبالؒ کا سرچشمہ - قرآن، ص ۷)

انہوں نے ۱۹۲۵ء میں، مولانا اکبر شاہ خان نجیب آبادی (مرحوم) کے نام اپنے ایک خط میں لکھا تھا:- آپ نے ٹھیک فرمایا تھا۔ پیشہ ور مولویوں کا اثر سرسید کی تحریک سے بہت کم ہو گیا تھا مگر خلافت کمیٹی نے اپنے پولیٹیکل فتوؤں کی خاطر ان کا اقتدار ہندی مسلمانوں میں پھر قائم کر دیا۔ یہ ایک بہت بڑی غلطی تھی جس کا احساس ابھی تک غالباً کسی کو نہیں۔ مجھ کو حال ہی میں اس کا تجربہ ہوا ہے۔ کچھ مدت ہوئی میں نے اجتہاد پر ایک انگریزی مضمون لکھا تھا جو یہاں ایک جلسے میں پڑھا گیا تھا، انشاء اللہ شائع بھی ہوگا۔ مگر بعض لوگوں نے مجھے کافر کہا..... ہندوستان میں بالخصوص آج کل بہت سمجھ بھگ کر قدم اٹھانا چاہیے۔

(انوار اقبالؒ - ص ۳۱۷)

## مشرقی اور مغربی پاکستان

مجوزہ مملکت پاکستان کے خلاف عام طور پر یہ اعتراض بھی کیا جاتا تھا کہ اس میں ایک مملکت دو ایسے حصوں پر مشتمل ہوگی جن میں قریب ایک ہزار میل کا فاصلہ ہوگا۔ ان میں نظم و ضبط اور رابطہ اور واسطہ کا ذریعہ کونسا ہوگا۔ قائد اعظمؒ نے ۱۹ فروری ۱۹۳۸ء کو آسٹریلیا کے باشندوں کے نام اپنے ایک براڈ کاسٹ میں پہلے یہ فرمایا:-

مغربی پاکستان، مشرقی پاکستان سے قریب ایک ہزار میل کے فاصلہ پر ہے۔ اور ان کے درمیان مملکت ہند کا علاقہ حائل ہے۔ بیرونی ممالک کے ایک طالب علم کے دل میں جو پہلا سوال اُبھرے گا وہ یہ ہوگا کہ ایسی مملکت کا قیام کس طرح ممکن ہوگا۔ ایسے دو خطوں میں، جن میں اس قدر بعد ہو، وحدت حکومت کس طرح ممکن ہوگی، میں اس سوال کا جواب صرف ایک لفظ میں دوں گا۔ اور وہ یہ کہ ایسا ہمارے ایمان کی رُو سے ہوگا۔ ایمان خدا پر، ایمان اپنے آپ پر، ایمان اپنے مستقبل پر۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جو لوگ ہم سے اچھی طرح واقف نہیں، وہ ایسے مختصر سے جواب کا پورا پورا مفہوم سمجھ نہیں سکیں گے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اس اجمال کی حقوڑی سی تفصیل

بھی بیان کر دیں۔

اس کے بعد انہوں نے فرمایا :-

پاکستان کی آبادی کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ ہم محمد رسول اللہ کی تعلیم کے پیرو ہیں۔ ہم اس اسلامی برادری کے ارکان ہیں جس میں حقوق، شرف و احترام اور تکریم ذات کے اعتبار سے تمام افراد برابر ہوتے ہیں۔ بنا بریں ہم میں اخوت اور وحدت کا بڑا گہرا جذبہ ہے۔ ہماری اپنی تاریخ ہے اور اپنی رسوم و رواجیات۔ ہم اپنے نظریات زندگی، نقطہ نگاہ اور احساس دروں کے مالک ہیں اور یہی ہیں وہ عوامل جو قومیت کی تشکیل کا مدار بننے ہیں۔ (ان بنیادوں پر ہم ایک قوم بننے ہیں)۔

(تقاریر بحیثیت گورنر جنرل - ص ۵۸)

آپ نے بعض لوگوں کو جو اپنے دل میں مملکت پاکستان اور اس کے معارف کا اعلیٰ علم کے خلاف خبیثانہ رکھتے ہیں، یہ کہتے سنا ہوگا کہ تحریک پاکستان کے دوران قائد اعظم نے اسلام کا نام محض ایک وکیلانہ حربہ کے طور پر لیا تھا۔ درحقیقت ان کا مقصد یہ نہیں تھا کہ پاکستان ایک اسلامی مملکت ہوگی۔ ان کے تصور میں اس کا نقشہ ایک سیکولر اسٹیٹ ہی کا تھا۔ آپ سنیہ کہ انہوں نے تشکیل پاکستان کے بعد بحیثیت گورنر جنرل اکتوبر ۱۹۷۴ء میں خالق دینا دل کراچی میں، حکومت پاکستان کے افسروں سے اپنے اولین خطاب میں کیا فرمایا تھا۔ انہوں نے کہا تھا :-

پاکستان کا قیام، جس کے لئے ہم گزشتہ دس سال مسلسل کوشش کر رہے تھے۔ اب خدا کے فضل سے ایک حقیقت ثابت بن کر سامنے آچکا ہے۔ لیکن ہم اسے لئے اس آزاد مملکت کا قیام مقصد بالذات نہیں تھا، بلکہ ایک عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔ ہمارا مقصد یہ تھا کہ ہمیں ایک ایسی مملکت مل جائے، جس میں ہم آزاد انسانوں کی طرح رہ سکیں اور جس میں اپنی روشنی اور ثقافت کے مطابق نشوونما پاسکیں اور اسلام کے حدیثی اصول آزادی طور پر رو بہ عمل لائے جاسکیں۔

(تقاریر بحیثیت گورنر جنرل - ص ۲۲)

یہ تھا عزیزانِ من! وہ حسین خواب، جسے ہم نے غیر منقسم ہندوستان کی شب تیرہ و تار میں دیکھا تھا۔ خود قائد اعظم نے اہل امریکہ کے نام اپنے براڈ کاسٹ میں فرمایا تھا کہ "پاکستان جو دس کروڑ مسلمانوں کے حسین خوابوں کی تعبیر ہے، پندرہ اگست ۱۹۴۷ء کو وجود میں آگیا۔ یہ دنیا میں سب سے بڑی اسلامی مملکت اور تمام دنیا کی مملکتوں میں پانچویں درجہ پر ہے۔"

(۱۰)

یہ تھا ہمارا خواب۔ اب اس خواب کی تعبیر دیکھئے۔ مگر دیکھنے کے لئے آپ کو جگر تھام کر بیٹھنے کی ضرورت ہوگی، اس لئے کہ :-

**خواب کی تعبیر**

ہم اپنی روداد کیا سنائیں، کچھ اس میں ہی واقعات ایسے اگر کوئی دوسرا سنا تا، ہمیں سمجھتے اسے افسانہ!



پاکستان کا حسین خواب حریروا طمس کے دو نرم و نازک دھاگوں سے بنا گیا تھا۔ ایک یہ کہ مسلمان ایمان کے اشتراک کی بنیادوں پر غیر مسلموں سے الگ قوم ہیں، اور دوسرا یہ کہ پاکستان ایک اسلامی مملکت ہوگی جس کا بنیادی دستور خدا کی عظیم کتاب قرآن کریم ہوگا۔ اب یہ دیکھئے کہ ہم نے اس تارے بانے کے ساتھ کیا کیا اور اس کا نتیجہ کیا نکلا۔

مملکت پاکستان کی بنیاد اس دینی حقیقت پر رکھی کہ غیر مسلم اور مسلم مل کر ایک قوم نہیں بن سکتے۔ قائد اعظم تشکیل پاکستان کے بعد صرف ایک برس تک زندہ رہے، اور وہ بھی صدر قسم کے مصائب و مشکلات میں گھرے ہوئے اور گونا گوں عوارض کا شکار۔ ان کی وفات کے بعد دنیا یہ دیکھ کر محو حیرت رہ گئی کہ خود حکومت پاکستان نے اپنی مملکت کے اس بنیادی ستون کو اپنے ہاتھ سے ڈھا دیا۔ وہ اس طرح کہ انہوں نے اس مملکت کی حدود کے اندر بسنے والے مسلمان اور غیر مسلموں کو اشتراک وطن کی بنا پر ایک قوم تسلیم کر لیا۔ اس سے اس مملکت نے خود اسلام کے ایک بنیادی اصول سے جس طرح انحراف کیا، اسے تو چھوڑ بیٹے، دیکھئے یہ کہ اس سے اس کی سیاست پر کیا اثر پڑا؟ مشرقی پاکستان میں ہندوؤں کی آبادی کم و بیش ڈیڑھ کروڑ تھی۔ وہ ایک خاص منصوبے کے تحت وہیں رہ گئے۔ ہندوستان کی طرف منتقل نہیں ہوئے۔ اس کا ایک نتیجہ تو یہ نکلا کہ انہوں نے وہاں کے مسلمان بنگالیوں کے ذہن میں یہ خیال ابھارنا شروع کر دیا کہ تمہاری آبادی مغربی پاکستان کی آبادی کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔ لہذا جمہوریت کی رو سے مملکت پاکستان کی تمام اقتدار تمہارے ہاتھ میں ہونی چاہیئے۔ اکثریت اور اقلیت کا یہ سوال بچائے خویش نظریہ پاکستان یا اسلام کے تصور کے خلاف تھا۔ جب کم از کم، ایک ملک میں رہنے والے تمام مسلمان ایک قوم یعنی امت واحدہ ہوں تو ان کے اندر اکثریت اور اقلیت کا سوال کیا! یہ تفریقی لعنت تو مغربی نظام جمہوریت کی پیدا کردہ ہے، جس میں قوم سیاسی پارٹیوں میں بٹ جاتی ہے اور جو پارٹی کسی طرح عدوی اکثریت حاصل کرنے، تمام اقتدار اس کے ہاتھ میں آ جاتی ہے، اور دوسری پارٹیوں کو اس کا حق دے دیا جاتا ہے کہ وہ اس پارٹی کے خلاف ایجنڈا پیش کرتی رہیں، اور یوں قوم کے انتشار، خلفشار اور فساد کے جراثیم پرورش پاتے رہیں۔ اس مقام پر میں آپ کی توجہ ایک اور دلچسپ حقیقت کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ انگلستان میں جمہوری نظام رائج ہے وہاں اکثریت اور اقلیت کا سوال ایوان پارلیمنٹ کے اندر تک محدود ہے۔ ملک میں مذہب کی بنیادوں پر اکثریت اور اقلیت کا کوئی سوال نہیں۔ وہ سب ایک ہی قوم کے افراد ہیں۔ جمہوری نظام، بھارت میں بھی رائج ہے۔ لیکن وہاں ایک اکثریت، اقلیت پارلیمنٹ کے اندر ہے، اور دوسری اکثریت۔ اقلیت عام ملک کے اندر۔ یعنی ہندو، اکثریت اور غیر ہندو، (مسلمان، عیسائی وغیرہ) اقلیتیں۔ ہم نے اپنے ہاں نظام جمہوریت بھی رائج کیا تو بھارت کے نمونے کا، جس کی رو سے، ایک اکثریت اور اقلیت، پارلیمنٹ کے اندر ہے۔ دوسری اکثریت۔ اقلیت، بریٹائے مذہب، ملک کے اندر۔ اور پھر ان دونوں پر مشتمل پاکستانی قوم۔

یعنی اس میں دین کے ایک مسئلہ، اور مطالبہ پاکستان کی بنیاد سے انحراف تو ایک طرف، خود نظام جمہوریت کی بھی نفی ہوتی ہے۔ جب کوئی قوم سوچنا چھوڑ دے تو اس کا یہی نتیجہ ہوتا ہے :

بہر حال ہمارے ہاں مغربی نظام جمہوریت اختیار کر لیا گیا۔ حتیٰ کہ اقامت دین کی علمبردار ہونے کی مدعی جماعتوں تک نے اسے اسلامی قرار دے دیا۔ مشرقی پاکستان کے ہندوؤں کے پیش نظر مقاصد کے لئے یہ نظام بڑا سازگار تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھئے کہ مشرقی پاکستان میں ہندوؤں کی صرف

## مشرقی پاکستان میں ہندو

تعداد ہی اتنی کثیر نہ تھی، وہ وہاں کی مسلمان آبادی کے مقابلہ میں ہر اعتبار سے دستِ غالب کی حیثیت رکھتے اور زندگی کے ہر شعبہ پر چھائے ہوئے تھے۔ تجارت، سیاست، اقتصادیات، معاشرت حتیٰ کہ تعلیم تک کا ہر گوشہ ان کے زیر اثر تھا۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ وہاں اسلامیات کے مدرس بھی ہندو تھے! نتیجہ اس کا یہ کہ وہ خطہ وزین، حصہ تو ملکیت پاکستان کا تھا لیکن حکومت وہاں بھارتی ہندوؤں ہی کی تھی۔ مشرقی پاکستان سے نیچے آنے والے قریب قریب یہی پوزیشن سندھ کی تھی، وہاں بھی ہندو بڑی مؤثر حیثیت رکھتے تھے۔

انگریز کے زمانے میں سارے ہندوستان کا نظام ایک حکومتی تھا جس میں اقتدار کا سرچشمہ مرکزی حکومت تھی۔ انتظامی سہولتوں کے پیش نظر ملک کو ضلعوں، کمشنریوں اور صوبوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ اُس وقت صوبوں کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں تھی۔ پاکستان میں بدقسمتی سے ایسی فضا پیدا کر دی گئی جس میں مختلف صوبوں نے اپنے آپ کو الگ الگ حکومتیں سمجھنا شروع کر دیا۔ حکومتیں ہی نہیں بلکہ الگ الگ قومیتیں۔۔۔۔۔ اس احساس کے آثار بھی اولا مشرقی پاکستان میں پیدا ہونے شروع ہوئے

## صوبائی تفریقات

اور اتنی جلدی کہ وہاں زبان کے اختلاف کی آڑ میں بنگالیوں اور غیر بنگالیوں میں فسادات شروع ہو گئے، اور حالات ایسی نزاکت اختیار کر گئے کہ خود قائد اعظم کو وہاں جانا پڑا۔ یہ شروع سال ۱۹۴۷ء کی بات ہے۔ وہ وہاں قریب نو دن ٹھہرے۔ واپسی پر انہوں نے وہاں کے رہنے والوں کے نام ریڈیو سے ایک اوداعی پیغام نشر کیا جس کے دوران فرمایا:

پاکستان، مسلم قومیت کی وحدت کا مظہر ہے اور اسے ایسا ہی رہنا چاہیے۔ ہمیں حقیقی مسلمان ہونے کی حیثیت سے اس وحدت کا پورا پورا تحفظ کرنا چاہیے۔ اگر ہم نے اپنے آپ کو اولاً بنگالی، پنجابی، سندھی وغیرہ کی حیثیت سے سمجھنا شروع کر دیا، اور مسلمان اور پاکستانی ہونے کی حیثیت محض اتفاقاً قبیلہ تصور کر لی گئی تو پھر پاکستان کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ یہ نہ سمجھئے کہ یہ کوئی بعید از قیاس اور ناقابلِ فہم سا مسئلہ ہے۔ ہمارے دشمنوں کو اس کے امکان کا اچھی طرح اندازہ ہے، اور انہوں نے ابھی سے اس کے لئے بساط بچانی شروع کر دی ہے۔ میں آپ سے صاف صاف بات کرنا چاہتا ہوں۔

ذرا سوچئے کہ جب سیاسی ایجنسیاں اور ہندو پریس، جس نے تشکیل پاکستان کی انتہائی مخالفت کی تھی، مشرقی بنگال کے مسلمانوں کے مزاحمت منصفانہ حقوق کا درد دل میں لے کر اٹھیں، تو کیا یہ ایک انتہائی شرانگیز چال نہیں ہوگی۔ کیا اس سے یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے نہیں آ جاتی کہ یہ عناصر تخلیق پاکستان کی ہم میں ناکام رہ گئے تو اب انہوں نے اس کے اندر انتشار پیدا کر کے اسے ختم کرنے کی ٹھان لی ہے اور اس کے لئے ایسا شرانگیز پروپیگنڈا شروع کر دیا ہے، جس سے ایک مسلمان بھائی دوسرے بھائی کے خلاف لڑنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔

پاکستان دشمن عناصر کی ان شرانگیزانہ سازشوں کا وجود بجا اور درست۔ لیکن سوال یہ ہے کہ مسلمان ان کا شکار کیوں ہونے لگ گئے؟ اس کا جواب صاف اور واضح ہے۔ ہم ہندوستان سے معلم قومیت اور پاکستانی آئیڈیالوجی کے نظریات لے کر تو ضرور آئے تھے، لیکن ان کی بنیادوں پر ایک اُمت نہیں بن پائے تھے۔ نہ ہی ہم نے اس کا احساس کیا تھا کہ یہی ہماری مملکت کے ستون اور ہمارے مجدگانہ شخص اور وجود کی وجہ جواز ہے۔ تحریک پاکستان کے دوران نہ اتنا وقت تھا، نہ اتنی فرصت کہ ہم ایسا کر سکتے۔ یہاں آنے کے بعد میں نے اس کا احساس کیا، قرآن کریم کی روشنی اور قوموں کی نفسیات کے مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس کا علاج، اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم اپنے نصاب و نظام تعلیم کو یکسر بدل دیں تاکہ ہماری آنے والی نسلوں کی ذہنی اور قلبی تربیت اس انداز کی ہو کہ وہ ان نظریات کی حامل قوم بن کر اُبھرے۔

## تعلیمی انقلاب کا تصور

یہاں جو حضرات برسرِ اقتدار تھے، اسے حسن اتفاق سمجھئے کہ تحریک پاکستان کے دوران، ہم قافلہ ہونے کی وجہ سے، ان میں سے اکثر کے سامنے میرے مراسلے یا کم از کم تعارف تھا۔ اس لئے ان تک مجھے باریابی حاصل تھی۔ میں نے ان میں سے ایک ایک پر اس تبدیلی کی اہمیت واضح کی اور اس مقصد کے لئے بلا مزد و معاوضہ اپنی حقیر سی خدمات بھی پیش کر دیں۔ وہ نظری طور پر اس سے اتفاق کرتے رہے۔ لیکن ہماری بد قسمتی کہ عملاً ان میں سے کسی نے بھی کچھ نہ کیا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ ہماری آنے والی نسل، جسے ہمارے دیکھتے دیکھتے ملتِ پاکستان بن جانا تھا، بے راہروی کی اُسی قدیم فغا میں پروں میں پاتی رہی۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، مشرقی پاکستان کی نئی نسل کاملاً ہندوؤں کی گرفت میں تھی۔ وہاں کا پورا نظام تعلیم ان کے ہاتھ میں تھا۔ اس تعلیم نے وہاں کس قسم کے نوجوان پیدا کئے، اس کی ایک ہلکی سی جھلک اس خط سے سامنے آ جاتی ہے جو ڈھاکہ یونیورسٹی

## اس تعلیم کے برگ و بار

کے ایم اے فاضل کے طالب العلم عزیز الرحمن نے روزنامہ (DAILY PAKISTAN) کی ۱۹۶۹ء کی اشاعت میں شائع کیا تھا۔ .... اس خط کا اردو ترجمہ حسبِ ذیل ہے:-  
۱۹۶۷ء میں، تشکیل پاکستان کے ساتھ مغربی پاکستان کی طرف سے جو ہر ہادی طرف

آئی تو اس سے ہم نے اپنے بنگالی تشخص کو فراموش کر دیا۔ پنجابیوں، سندھیوں اور بہار یوں کے ساتھ خلا ملا کی وجہ سے ہم اس قدر بے وقوف بن گئے کہ ہم نے یہ سمجھنا شروع کر دیا کہ ہم اولاً مسلمان ہیں اور اس کے بعد بنگالی، بہاری، پنجابی وغیرہ۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ سامراج ہندوستان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے پر مجبور ہو گیا تھا۔ (جس کے نتیجہ میں پاکستان، بھارت سے علیحدہ ہو گیا تھا) لیکن آج ہمیں قدرے اطمینان کا سانس لینا چاہیے کہ مختلف اداروں کی کوشش سے خوابیدہ بنگالیوں میں حرکت کے آثار نمایاں ہو رہے ہیں۔ ہم شرمی جیتنیا، خودی رام، سمجاش ہوس، بیجاٹے سنگھ جیسے اپنے قومی مہر و زور کو فراموش کر بیٹھے اور ان کی جگہ خالد، طارق، موسے اور (معاذ اللہ) علی حبیبوں کو اپنا میرد سمجھنے میں فخر محسوس کرنے لگ گئے تھے۔ ہم اپنے بچوں کا نام اپنی زبان کے بجائے ایک اجنبی زبان میں لکھنے میں خوشی محسوس کرتے تھے۔ ہم نے اپنے دیس کے بھگوان کو بھلا دیا اور اس کی جگہ ایک غیر ملکی خدیۃ اللہ کو اپنا معبود تصور کر لیا تھا۔ ہم نور اللہ اور خلیل اللہ جیسے ناموں پر رکتے تھے اور ناگن کھاگن جیسے سیدھے سادھے ناموں کو نیاگ بیٹھے تھے یہ سب ان رنگین چشموں کا نتیجہ ہے جسے باہر سے در آمد کیا گیا ہے..... لیکن اب ہمارا بنگالی جذبہ آہستہ آہستہ بیدار ہوتا جا رہا ہے۔ اس سے اسلامی قومیت کے بندھن ڈھیلے پڑ جائیں گے اور علاقائی قومیت کے رشتے مضبوط ہو جائیں گے۔ مشرقی بنگال کی اس دش کے نتیجے میں مغربی پاکستان میں ہمارے سندھی بھائی بیدار ہو رہے ہیں۔ انہوں نے بھی یہ سمجھنا سیکھ لیا ہے کہ ہم اردو اتھر کی اولاد ہیں، اور پہلے سندھی اور اس کے بعد کچھ اور ہیں۔ اگر ہم اسی طریق سے اپنے دیگر اہل وطن کے تعلیمات کو بھی متاثر کرتے رہے کہ وہ جغرافیائی اور لسانی قومیت کو اسلامی قومیت پر ترجیح دیں تو مغرب کی عیسائی قوموں نے ترکوں کی خلافت کو تباہ کر کے جو کچھ حاصل کیا تھا، ہم اس سے بھی زیادہ حاصل کر لیں گے۔



پاکستان کو ہم اپنا بدترین دشمن سمجھتے ہیں۔ یہ جھوٹ ہے کہ سندھ صرف اسلام اور اسلامی فلسفہ کی وجہ سے عظیم ہے۔ سندھ کی عظمت، سندھ کے سادہ لوح بہادر عوام ہیں۔ سندھ موہنجودادو، کوٹ ڈی جان کے آثارِ قدیمہ، اور لطیف، سچل، ایاز، جی ایم سید کی طرح کے شاعروں اور دانشوروں کی وجہ سے عظیم ہے۔ وہ اپنی تہذیب کی وجہ سے عظیم ہے (نکہ اسلام کی وجہ سے)۔

(طلوع اسلام - دسمبر ۱۹۶۸ء)

اور آگے بڑھتے۔ مشرقی پاکستان کے ۱۹۷۱ء کے المیہ کے بعد اور اس قیامتِ صغریٰ کے پیش نظر جوہاں کے "بہا۔ بی" (یعنی غیر بینگالی) مسلمانوں پر گزری، سندھ کی ایک کمیٹی — غزالہ بلوچ — کا ایک خط اخبار "ڈیلی نیوز" کراچی کی ۱۹ اگست ۱۹۷۲ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ جس میں اس نے لکھا تھا:-

اگر مشرقی پاکستان کے بہاوی، پاکستانی فوج اور مرکزی حکومت کے بجائے بنگالی علیحدگی پسندوں کی حمایت کرتے تو وہ آج بڑی پُر مسرت حالت میں ہوتے، لیکن انہوں نے سخت حماقت کی اور پاکستان، ایک پاکستان کے ساتھ وفاداری پراصرار کرتے رہے اور اب اپنی حماقت کی قیمت اپنی اور اپنے بال بچوں کی جانوں کی شکل میں ادا کر رہے ہیں۔ بہاریوں کی بد قسمتی دراصل اس دن شروع ہوتی ہے جب انہوں نے ۱۹۴۷-۱۹۴۸ء میں پاکستان کے حق میں ووٹ دیا تھا۔ اگر بہاری مسلمان ہندوستان کے ہندوؤں کے اندر جذب ہو جاتے تو وہ آج بہار میں آرام اور چین سے زندگی کے دن گزار رہے ہوتے۔ ہندوؤں کے اندر جذب ہونے کے لئے انہیں صرف اس قدر کرنا پڑتا کہ اسلام چھوڑ کر، ہندو دھرم اختیار کر لیتے۔ اگر وہ ایسا کر لیتے، تو دو قومی نظریہ کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ ہندوستان میں ایک ہندو قوم ہوتی۔ اب بھی پاکستان میں رہنے والے مہاجرین کے سامنے دو راستے کھلے ہیں۔ یا تو وہ ہندو دھرم اختیار کر کے ہندوستان واپس چلے جائیں اور وہاں ایک عظیم ترقی پذیر قوم کا جزو بن کر رہیں اور پاکستان میں سندھی بن کر رہیں، جس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ایک بہت چھوٹی سی قوم کا جزو بن جائیں گے۔

(طلوع اسلام - اکتوبر ۱۹۷۲ء - صفحہ ۷)

یہ تھا اُس تعلیم و تربیت کا نتیجہ جو بہاوی درس گاہوں میں بہاری نئی نسل کو دی جا رہی تھی۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، میں ان تمام نظائر کو اب بابِ حل و عقد کی خدمت میں پیش کرتا رہا۔ ان میں سے بعض حضرات کی کشادہ نگہی مجھے نرم گرم باتیں کرنے کی بھی جرأت دلا دیتی تھی۔ میں اُن سے واضح کاف الفاظ میں کہتا کہ آپ پاکستان کی بہبود اور ترقی کے لئے جو کچھ کر رہے ہیں سب بجا اور درست لیکن آپ یہاں جس قسم کی قوم تیار کر رہے ہیں، اس کے ہاتھوں مجھے خود پاکستان کا وجود خطرہ میں نظر آتا



ہے۔ نہروں، پلوں، شڑکوں، منڈیوں، بینکوں، کارخانوں سے کہیں زیادہ اہمیت ان درسگاہوں کو حاصل ہوتی ہے جن میں نئی قوم زیر تعمیر ہوتی ہے۔ ان درس گاہوں میں جس قسم کی نسل پرورش پائی ہے، جب وہ آگے بڑھ کر قوم بن جائے گی تو وہ تباہی مچا دے گی اور یہ دیلیں، شڑکیں، نہریں، سب دھری کی دھری رہ جائیں گی۔ لیکن اسے انہوں نے اُن سنی کر دیا، اور قوم اسی پنج پر تیار ہوتی رہی۔ یہ کچھ تو ہماری نئی نسل کے ساتھ ہو رہا تھا۔۔۔۔۔ جہاں تک ہماری سابقہ نسلوں کے بقیات کا تعلق ہے، جنہیں ہم مسلمانوں کی وہ قوم کہہ سکتے ہیں جو تقسیم ہند سے پہلے ہندوستان میں موجود تھی، ان کے دل میں مذہب کی عقیدت بڑی پختگی سے پیوست ہے۔ ان کی صورت میں سوال یہ سامنے آتا ہے کہ مذہب کا صحیح تصور کیا ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اسلام کا جو تصور بنیادی طور پر علامہ اقبالؒ نے پیش کیا تھا، اور پھر قائد اعظمؒ نے اس کا عام چرچا کیا، اس کی رُو سے اسلام ایک مذہب نہیں، الدین ہے جس کے احاطہ میں دنیاوی زندگی کا ہر شعبہ آجاتا ہے اور اسی الدین کو عملاً رائج کرنے کے لئے مملکت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہندوستان کے ہندو نے اس حقیقت کو مہانہ لیا تھا۔ اس خطرہ کی روک تھام کے لئے اس نے سوچا یہ تھا کہ مذہب کا ایک ایسا مفہوم پیش کر دیا جائے جو مسلمانوں کے قدیم مذہب پرست طبقہ کے جذبات کی تسکین کا سامان تو فراہم کر دے، لیکن عملاً وہ ایک مفلوج قوم بن کر رہ جائے۔ اس ضمن میں، پنڈت جواہر لال نہرو نے مشہور برہمن سماجی رہنما، مشرے کی شپ چندر سہین، کی صد سالہ برسی کی تقریب میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ:-

ہندوستان میں اسلام ایک غلط طریق پر آیا۔ بایں ہمہ ان ہر دو متضاد تصورات زندگی، (اسلام اور ہندومت) میں امتزاج پیدا کرنے کے لئے ایک کورس سرے میں جذب کرنے کا عمل شروع ہو گیا۔ یہ سلسلہ گورو نانک اور مجھت کبیر جیسی شخصیتوں اور اکبر جیسے بادشاہ کی کوششوں سے کافی ترقی کر گیا۔ اس کے بعد یہ کوششیں ماند پڑ گئیں لیکن یہ سلسلہ بالکل منقطع نہیں ہوا۔ رفتہ رفتہ آگے بڑھتا رہا۔ لیکن قبل اس کے کہ یہ منزل مقصود تک پہنچ جاتا، ایک بیرونی طاقت ہندوستان آ پہنچی۔

(پمفلٹ معرکہ دین و وطن انڈیا پریس - ۱۳۷۱ء)

تصوف بطور سیاسی حربہ | یہ فروری ۱۹۳۹ء کی بات ہے۔ اسی سال ۲۶ مارچ کو دیوان لال چند نول رائے نے اپنی ایک نشری تقریر میں کہا:-

تصوف ہی وہ ذریعہ ہے جس کی رُو سے امید کی جاسکتی ہے کہ تمام اہل ہند قومیت و اہدہ کے رشتہ میں پروئے جائیں گے اور یہی چیز ہندوستان کی سیاسی معاشی اور معاشرتی مسائل کے صحیح حل کی طرف راہنمائی کر سکتی ہے۔ (ایضاً)

اسلام کے اس تصور (یعنی تصوف) کے لئے سندھ کی سرزمین بڑی سازگار تھی، کیونکہ وہاں ہندوؤں نے اس سے بہت پہلے اسے ایک تحریک کی شکل دے رکھی تھی۔ آپ کو یہ سن کر شاید حیرت ہو کہ سندھ کے بڑے بڑے صوفیاء، فقراء اور سرستوں کے مریدوں میں ہندوؤں کی تعداد بڑی کثیر تھی۔ اور ان کے مزارات اور خانقاہوں کی تعداد میں ان کا اثر غالب تھا۔ معلوم نہیں، اب وہاں کیا کیفیت ہے، لیکن اسلام کا یہی تصور ہے جو وہاں کی فضا پر عام طور پر مستط ہے۔ اور جی، ایم۔ سید، جو سندھ کی علیحدگی کے جراثیم عام کر رہے ہیں، وہاں اسی اسلام کے احیاء یا فروغ کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ انہوں نے آج سے کچھ عرصہ پہلے سندھی زبان میں ایک کتاب لکھی تھی، جس کا اردو ترجمہ ”جیسا کہ میں نے دیکھا“ کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ انہوں نے اس میں پہلے صحیح اسلام کے بنیادی مسلمات کی مخالفت اور تردید کی، بلکہ ان کا مذاق اڑایا اور اُس کے بعد کہا کہ:-

صحیح ترین تصور حیات، تصوف ہے۔ جس کا اہم اصول وحدت مذاہب ہے۔ تصوف عدم تشدد یا اہمیت کا حامی ہے۔ وہ حق و صداقت پر کسی مخصوص گروہ کی اجارہ دار تصور نہیں کرتا۔ وہ کسی بھی مذہبی، اقتصادی اور سیاسی نظریہ کو حرف آخر جان کر اُس کی اندھی تقلید سے گریز کرتا ہے۔

(صفحہ ۲۰۵۔ بحوالہ پمفلٹ معرکہ دین و وطن - ص ۲۲)

مسطر سید نے اس کتاب کے آخری صفحہ پر لکھا ہے:-  
صوفی، مذاہب و عقیدہ کی بنیاد پر قومیت استوار کرنے کے خلاف ہے، اور مذاہب کے موجودہ تعصبات کو درست نہیں سمجھتا۔ وہ مذاہب اور سیاست کو ایک دوسرے سے علیحدہ رکھنے کا حامی ہے۔

(صفحہ ۲۰۷۔ بحوالہ پمفلٹ معرکہ دین و وطن - ص ۲۲)

تشکیل پاکستان کے بعد، پاکستان کے بنیادی نظریات کے خلاف یہ جراثیم سندھ کے خطہ زمین تک ہی محدود نہیں رہے۔ بلکہ اسے عام کیا اور بڑی شدت سے پھیلا یا گیا۔ جن حضرات نے تقسیم ہند کا زمانہ دیکھا ہے، انہیں معلوم ہے کہ اس وقت پاکستان میں مرجع خلافت، مزارات اور صوفیاء کی درسگاہیں موجود تو تھیں، لیکن ان کی تعداد بہت کم تھی، اور ان کے سلسلہ میں منائی جانے والی تقاریب اور ان میں شمولیت اختیار کرنے والے زائرین اتنے پُرہجوم نہیں ہوتے تھے۔ اس کے بعد آپ دیکھئے کہ اس اٹھائیس سال کے عرصہ میں یہ سلسلہ کہاں تک پہنچ چکا ہے۔ اب ملک کی ساری فضا اس سے معمور ہو چکی ہے۔ کوئی جگہ خالی نہیں جہاں ان مزارات کی نمود نہ کر دی گئی ہو، اور سال بھر میں کوئی دن ایسا نہیں آتا جب ان کے سلسلہ میں کوئی نہ کوئی تقریب نہ منائی جاتی ہو۔ عرس، میلے، قوالیاں، مشاعرے، مزارات کے غسل اور چادیاں چڑھانے کی تقاریب، نذر و نیاز کی

دیگیں، چڑھاوے۔ قیمتی پتھروں کے فرش، مرصع چھتیں، چاندی اور سونے کے دروازے اور نہ معلوم کیا کیا، جن کا نہ اس سے پہلے کہیں وجود تھا نہ اس قدر رنود۔۔۔۔۔ اب یہ چیزیں بیابا کے عالمگیر مذہب کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں۔ اس سلسلہ میں یہ حقیقت اور بھی قابل غور ہے کہ قوم کے نام نہاد ترقی پسند دانشور (یعنی کمیونسٹ) جو خدا اور رسولؐ تک کے منکر اور اسلام کا مضمحلہ اڑانے میں پیش پیش ہوتے ہیں، وہ بھی بڑے ذوق و شوق سے ان تقاریب میں شامل ہوتے اور بڑے جوش و خروش سے ان میں حصہ لیتے ہیں۔

کمیونسٹوں یا سوشلسٹوں کی ٹیکنیک یہ ہے کہ معاشرہ کے نوجوان طبقہ میں فحاشی، بد اخلاقی، اور قانون شکنی کے رجحانات عیاں کرتے جائیں، تاکہ ملک میں ہر طرف خلفشار اور انتشار پھیل جائے۔ دوسری طرف مذہب پرست طبقہ کو ایسے مشاغل میں الجھاتے چلے جائیں، جن سے وہ عالمِ کردار سے یکسر بے گانہ ہو جائیں اور دنیاوی یا سیاسی امور میں دلچسپی لینا ہی چھوڑ دیں۔ چونکہ یہ لوگ کسی اخلاقی قدر کے قائل ہی نہیں ہوتے اس لئے وہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے ہر حربہ اختیار کر لیتے اور ہر رنگ کا بہروپ بھر لیتے ہیں۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ یہ لوگ خدا اور رسولؐ کے منکر اور لمحہ اور دہریہ ہونے کے باوجود اہل اللہؑ کی مجالس میں شریک ہوتے، صوفیاء کی تقاریب میں بھرپور حصہ لیتے۔ حتیٰ کہ عید میلاد النبیؐ کے سلسلہ میں منعقد..... مشاعروں میں نعتیں تک پڑھتے نظر آئیں گے۔

ان حضرات کی یہی ٹیکنیک ہے جس کی رو سے کیفیت یہ ہے کہ ایک طرف قوم کو مساوات، متحدی اور اسلامی سوشلزم کا جھنجھنا دیا جاتا ہے اور دوسری طرف یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ ہم اپنی بقا کی جدوجہد سے آگے بڑھ کر اپنی سر بلندی کی جدوجہد کا آغاز کر رہے ہیں، اور یہ آغاز اس لمحہ ہو رہا ہے جب سر زمین ایشیا میں دیت نام اور کمبوڈیا کے مجاہدوں نے وقت کے افق کو اپنے خون کی شعاعوں سے سرخ کر دیا ہے۔ جن ازلی دشمنوں سے ہمیں سابقہ ہے، ان سے ٹپٹنے کا راستہ روشن ہو چکا ہے۔ یہ پیام دے رہی ہے مجھے باد صبح گا ہی کہ اگر پاکستان کو جینا ہے، اور سر بلند ہو کر جینا ہے تو ایشیا کے افق پر اٹھری ہوئی سرخی سے اپنی مانگ بھرنی ہوگی، اور اس سرخی میں اضافہ کرنے کے لئے اپنے لہو میں نہانا ہوگا۔ آزادی اور انصاف کا یہ سورج تاریخ کی تاریکیوں سے ابھر کر آیا ہے، اب اسے جتنی جلدی ہم اپنی رگوں میں اتار لیں، اچھا ہے۔ جتنی جلدی پاکستان میں سوشلزم آئے گا، اتنا ہی یہ سورج ہماری زمین سے ہم رشتہ ہوگا۔ اتنی ہی یہ زمین پھول پھل لائے گی۔

یہ اعلان کسی پرائیویٹ شخصیت نے اپنی نجی محفل میں نہیں کیا تھا۔ پنجاب کے سابق وزیر اعلیٰ محمد حنیف رائے صاحب

نے صوبائی پارلیمان کے اجلاس میں ۱۹۴۵-۴۶ء کا بجٹ پیش کرتے ہوئے بانگ دہل فرمایا تھا۔ بحوالہ روزنامہ نوائے وقت لاہور - ۱۵ جون ۱۹۴۵ء اور اس کے مخطوطے ہی دنوں بعد قوم کو یہ دھمکی بھی دی تھی کہ

اگر اب اس سوشلزم کا راستہ روکا گیا، جس کے بارے میں ہم اسلام کے حوالے سے بات کرتے ہیں، تو پھر اس ملک میں کمیونزم آجائے گا۔

(روزنامہ نوائے وقت لاہور - ۱۴ اگست ۱۹۴۵ء)

بات "اسلام کے حوالے" سے کرتے ہیں، اور ہماری مانگ..... ایشیا سے خوددار ہونے والے سرخ سویرے سے بھرتے ہیں۔! جہاں تک جمہوریت ہماری سیاست کے منشور می دعویٰ کا تعلق ہے، اس کے متعلق کہا گیا کہ۔

جمہوریت ہماری اصل منزل، سوشلزم کے حصول کے لئے پہلے پڑاؤ کی حیثیت رکھتی

ہے۔ سوشلزم کے قائل یہ جانتے ہیں کہ سوشلزم کا انقلاب ہمیشہ دو منزلوں میں

آیا کرتا ہے۔ پہلا مرحلہ قومی سطح پر جمہوری انقلاب مکمل کرنا ہوتا ہے اور دوسرا مرحلہ

سوشلسٹ انقلاب ہے۔ سوشلسٹ انقلاب کبھی پہلے مرحلہ پر نہیں آتا۔ (ایضاً)

اس قسم کے خیالات کے عام کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ پاکستان کا نظریہ جو اسلام ہی کے احیاء کا دوسرا نام تھا، دھول بن کر اٹھ چکا ہے، اگرچہ قوم کو دھوکہ دینے کے لئے نظریہ پاکستان اور اسلام کے الفاظ بھی برابر دھرائے جاتے ہیں۔

وجود پاکستان کی عمارت کا دوسرا ستون یہ تھا کہ مسلم قومیت کی بنیاد دین کی وحدت ہے، وطن کا اشتراک نہیں۔ اور دین کی وحدت کا اولیٰں مفہوم یہ ہے کہ مسلمان مختلف قومیتوں میں نہیں

بٹ سکتے۔ اس نظریہ کی بنا پر، اگر کچھ نہیں تو کم از کم مغربی پاکستان کے مسلمانوں کو ایک مستقل قوم قرار دیا جانا ضروری تھا۔ وحدت دین کو بھی چھوڑ

کم از کم وحدت وطنیت کی بنا پر بھی یہاں کے باشندوں کو ایک قوم تسلیم کرنا چاہیے تھا۔ لیکن یہاں ایک اور سازش کی گئی۔ مشہور روسی مصنف گانکووسکی نے اپنی تصانیف "تاریخ

پاکستان" اور "پاکستان کے عوام" میں اس تصور کو پیش کیا کہ مغربی پاکستان میں ایک قوم نہیں، متعدد قومیں بستی ہیں۔ اس تصور کو عام کرنے کے لئے ۱۹۶۵ء میں کراچی میں "عوامی ادبی انجمن" کے

نام سے ایک تنظیم ظہور میں آئی۔ اس کی طرف سے ایک پمفلٹ شائع ہوا، جس پر منجملہ دیگر "دانشورانِ قوم" جوش ملیح آبادی اور فیض احمد فیض کے دستخط ثبت تھے۔ اس میں کہا گیا تھا:-

ہمارے نزدیک اس جمہوری آزادی میں قوموں کی ترقی کا مسئلہ بھی شامل ہے۔ ہم چاہتے

ہیں کہ ہمارے ملک میں، جو مختلف قوموں کا وطن ہے، وہ حالات پیدا کئے جائیں کہ سب

قومیں، ان کی زبانیں اور تہذیبیں، کسی ایک قوم کے اثر اور تسلط سے آزاد ہو کر خود مختار

ترقی کر سکیں۔ اس لئے ہم ادیب تمام قوموں کے لئے یکساں داخلی خود مختاری اور ان کی زبانوں کے لئے تعلیم، دفتر اور ملازمتوں کی زبان بننے کا حق چاہتے ہیں۔ ہمارے نزدیک پاکستان کی تمام قومیں مساوی حقوق کی مالک ہیں۔

(طلوع اسلام - مئی ۱۹۶۲ء - ص ۲۲)

ان حضرات کی جراتیں کس قدر بے باک ہو گئی ہیں، اس کا اندازہ کرنے کے لئے ہمیں کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں۔ اس سے پہلے قائد اعظمؒ کے یوم پیدائش کی تقریب مختلف تنظیموں کے زیر اہتمام منائی جاتی تھی۔ اب دو تین سال ادھر سے خود حکومت کے زیر اہتمام قائد اعظمؒ کے یوم پیدائش کی تقریب منائی نہیں۔ پیدائش کا ہفتہ منایا جاتا ہے۔ اس سال یہ تقریب ۳، ۴، ۵، ۶ جنوری ۱۹۶۵ء کو سینار کی شکل میں اسمبلی ہال لاہور میں منائی گئی۔ اس تقریب میں کس کس قسم کے نظریات کی نشر و اشاعت کی گئی، اس کی ایک جھلک فیض صاحب کی اس تقریر سے سامنے آ جاتی ہے جو انہوں نے ۴ جنوری ۱۹۶۵ء کے اجلاس میں فرمائی اور جو فوائے وقت لاہور اور پاکستان ٹائمز لاہور کی ۵ جنوری کی اشاعتوں میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں انہوں نے قومی تشخص کی تلاش کے موضوع پر (بینظم خویش) تحقیق کرتے ہوئے تحریک پاکستان کے دوران دو قومی نظریہ کا ذکر کیا اور کہا کہ تشکیل پاکستان کے بعد اس نظریہ کو خیر باد کہہ دینا چاہئے۔ اور اس کے بعد فرمایا:-

حصول پاکستان کے بعد خود قائد اعظمؒ کے سامنے بھی دو قومی نظریہ کا تصور باقی نہیں رہا تھا۔ (کننی بڑی ہے یہ جملہات! ... طلوع اسلام) لیکن کچھ لوگوں نے اپنے مقاصد کے تحت اس نظریہ کو باقی رکھا۔ بہر حال پاکستانی قوم کا تشخص وہی ہے جو قائد اعظمؒ نے دیا تھا کہ وہ دھرتی جس کا نام پاکستان ہے، وہاں جو بھی رہتا ہے وہ پاکستانی قوم کا فرد ہے۔ اور یہی دھرتی قومیت ہے۔

یہاں سے کم از کم یہ مترشح ہوتا ہے کہ وطنیت کی بنیادوں ہی پر سہی، فیض صاحب نے مغربی پاکستان کے تمام باشندوں کو ایک قوم تو تسلیم کر لیا۔ لیکن نہیں! اسی تقریر کے اگلے چند فقرے بھی سن لیجئے۔ فرمایا:-

سرزمین اور فرد کے مرکب کا نام پاکستان ہے۔ اس لئے پہلے تو ہر آدمی کے دل میں اپنے گاؤں اور علامتہ کی محبت پیدا کی جائے۔ لیکن ایک دائرے کے اندر رہ کر اور اس دائرے کے اندر تہذیب و ثقافت اور دوسری علاقائی خصوصیات کو اجاگر کیا جائے۔ اس طرح جو چیز اُبھرے گی وہ پاکستان ہوگا۔

(طلوع اسلام - فروری ۱۹۶۵ء - ص ۶)

آپ نے غور فرمایا کہ مغربی پاکستان میں بھی علاقائی بنیادوں پر مختلف قومیتوں کے تصور کو کس طرح اجاگر کیا جا رہا ہے۔ فیض صاحب اسلام آباد ہی میں فروکش ہیں اور ایسا نظر آتا ہے کہ حکومت کے





ڈھاکہ کے طالب علم عزیز الرحمن لکھ اس خط کو ایک بار پھر سامنے لائیے، جس کا اقتباس پہلے پیش کیا چکا ہے۔ اس کے آخر میں اس سے کہا تھا کہ یہی خیالات اب سندھ میں بھی عام ہو رہے ہیں..... سندھ میں یہ سازشیں کس طرح رو بہ عمل ہیں، ان کی تفصیلات بہت کم سامنے آئی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ لیکن اس کے باوجود جو کچھ سامنے آتا ہے اس سے اندازہ لگ سکتا ہے کہ وہاں کی ہواؤں کا رخ کس سمت کو ہے۔ اس اجمال کی تفصیل گذشتہ دو تین برس سے طلوع اسلام کی مختلف اشاعتوں میں مسلسل پیش کی جا رہی ہیں۔ یہاں ان میں سے صرف ایک مثال کا ذکر ادینا کافی ہو گا۔ وہاں جسے سندھ متحدہ محاذ کے صدر مسٹر جی ایم سید نے ۳۱ مارچ ۱۹۷۳ء کو سندھ یونیورسٹی میں ”سندھ ہی شام“ کے موقع پر ایک تقریر کی تھی جس میں انہوں نے اپنے تمام نظریات ایک ایک کر کے پیش کئے تھے۔ مثلاً انہوں نے کہا تھا کہ سندھ ہی قوم پرستی کے بنیادی اجزا حسب ذیل ہیں:-

- (۱) سندھ کے جداگانہ ملک ہونے میں یقین رکھنا۔
- (۲) پاکستان ایک ملک نہیں بلکہ چار جداگانہ ملکوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں یقین رکھنا۔
- (۳) سندھ ہی وطن، زبان، کلچر، تاریخی روایات، سیاسی اور اقتصادی مفاد کی بنیادوں پر جداگانہ قوم ہے۔
- (۴) سندھ ہی قوم جداگانہ حیثیت میں اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق رکھتی ہے۔

اسلامی آئین اور اسلامی حکومت کے متعلق انہوں نے کہا کہ ان کا کوئی وجود ہی نہیں۔ جو لوگ ایسی باتیں کرتے ہیں وہ یا تو بے وقوف ہیں یا دھوکہ باز۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ سندھیوں کے پاس سر آنے والی حکومت کی پالیسی کو جانچنے کے لئے کچھ معیار ہونے چاہئیں، جن کے مطابق غلط اور صحیح ہونے کا فیصلہ کیا جائے۔ میری نظر میں وہ معیار یہ ہیں:-

- (۱) نظریہ پاکستان میں اعتماد رکھنے والی حکومت سندھیوں کو کبھی نادمہ نہیں پہنچا سکتی۔

- (۲) مضبوط مرکز میں اعتماد رکھنے والی حکومت سندھ کی دشمن ہے۔
- (۳) اسلامی آئین یا اسلامی حکومت پر یقین رکھنے والی حکومت سندھ کے لئے سخت نقصان دہ ہے۔

(۴) سندھیوں کی جداگانہ قوم اور سندھ و دیش سے انکار کرنے والی حکومت سندھ دشمن شہر کی جاسکتی ہے۔

(طلوع اسلام - جون ۱۹۷۳ء)

یہ سترہویں بات تھی۔ حال ہی میں "جئے سندھ سٹوڈنٹس فیڈریشن" کے صدر مٹھیر لائٹنگ کا ایک انٹرویو سنیے دار "اداکار" لاہور کی ۳۰ اگست تا ۱ ستمبر ۱۹۷۹ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ اس میں ایک سوال کے جواب میں اُس نے کہا: "شیخ مجیب علیحدگی نہیں چاہتا، لیکن اُسے علیحدگی کے لئے مجبور کر دیا گیا۔ اسی طرح اگر ہمیں مجبور کیا گیا تو ہم بھی علیحدہ ہو جائیں گے۔"

یہ ہیں وہ ہوائی جو مغربی پاکستان میں کئی برسوں سے چل رہی ہیں۔ میں نے بلوچستان اور صوبہ سرحد کا ذکر اس لئے نہیں کیا کہ ان سلوک کی تحریر کے وقت ان صوبوں کے رہنماؤں کے خلاف مندرجہ سپریم کورٹ میں زیر سماعت ہے اس لئے ان کی سرگرمیوں کے متعلق کچھ کہنا قانوناً ممنوع ہے۔ پنجاب کے حالات اور بھی ناگفتہ بہ ہیں۔ یہاں کے پرانے لوگ قدامت پرستی میں متشدد واقع ہوئے اس لئے مذہبی پیشوائیت انہیں فرقہ وارانہ فسادات میں بڑی آسانی سے الجھائے اور اپنی مفاد پرستیوں کا آلہ کار بنائے رکھتی ہے۔ یہاں کوئی دن امن چہیں سے نہیں گزرنا۔ جہاں تک نئی نسل کا تعلق ہے، اس کا ایک حصہ مولانا حضرات کے پیش کہ وہ اسلام سے متنفر ہو کر کیونرم کی آماجگاہ بننا چلا جا رہا ہے اور دوسرا حصہ جماعت اسلامی کے زیر اثر ہے۔ ان طالب علموں کا اسلام کے متعلق ذاتی علم برائے نام ہوتا ہے اس لئے انہیں جو کچھ اسلام کے نام سے سکھا پڑھا دیا جائے، یہ اس کے والہانہ معتقد ہو جاتے ہیں۔

ان کے ذہن میں مودودی صاحب کی شخصیت کو اس قدر پختہ طور پر نہ اسخ کر دیا گیا ہے کہ وہ ان کے بر قول کو دینی منزل من اللہ کی طرح واجب التسلیم قرار دیتے ہیں۔ مودودی صاحب کو امام احمد بن حنبلؒ اور امام ابن تیمیہؒ کا ہم پایہ، مزاج شناس رسولؐ جتنی کہ اللہ کا شاہکار بنا دیا گیا ہے۔ اُدھر مودودی صاحب کی کیفیت یہ ہے کہ ان کا اسلام، ان کی مصلحتوں کے تابع، جسے وہ حکمت عملی کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں، ہر کان بدلتا رہتا ہے۔ انہوں نے ان نوجوانوں کو تعلیم یہ دی ہے کہ جماعت سازی کے سلسلہ میں بڑے بلند آہنگ اور مقدس اصول پیش کرنے چاہئیں۔ لیکن جب ان پر عمل کرنے کا وقت آئے گا تو انہیں بالائے طاق رکھ کر حکمت عملی سے کام لینا چاہیے۔ اور قیامت یہ کہ انہیں بتایا یہ گیا ہے کہ (معاذ اللہ) خود رسول اللہ کا بھی مسلک تھا۔ انہیں تعلیم یہ دی گئی ہے کہ زندگی کی اہم ضروریات کے لئے جھوٹ بولنے کی ضرورت اجازت ہے بلکہ ایسے مواقع پر جھوٹ بولنا شرعاً واجب ہو جاتا ہے۔

انہیں یہ بتایا جاتا ہے کہ اپنے مخالف کو قتل کرنے کے لئے جھوٹ اور فریب سے کام لیا جاسکتا ہے۔ اور یہ کہ (معاذ اللہ) ایسا خود رسول اللہؐ نے ہی کیا تھا۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، ایک وقت میں کہا جاتا ہے کہ انتخابات میں حصہ لینا قطعاً ناجائز ہے اور دوسرے وقت میں اسے عین مطابق اسلام بتا جاتا ہے۔

ایک وقت کہا جاتا ہے کہ خوراک سمی امور میں قطعاً حصہ نہیں لے سکتی اور دوسرے وقت میں نکلت۔

بلوچستان کے لیڈر مشیر غلام بخش رینجو اور سردار میگل وغیرہ پھر سے چار قومیوں کا پھر برا اڈا رہے ہیں۔ (۱۹۷۹ء)

کے منصب صدارت تک کے لئے عورت کے انتخاب کی پُر زور حمایت کی جاتی ہے۔ ایک وقت کہا جاتا ہے کہ زمین اور دیگر ذرائع پیداوار، یا دولت اور جائیداد کی ذاتی ملکیت پر کسی قسم کی حد بندی عائد نہیں کی جاسکتی اور دوسرے وقت میں خود ہی ان کی حد بندی کی تجویز کی جاتی ہے۔ ایک وقت کہا جاتا ہے کہ نیشنلائزیشن بدترین نظام ہے جسے ابلیس ایجاد کر سکا ہے اور دوسرے وقت میں اس کی خود ہی سفارش کی جاتی ہے۔ ایک وقت میں کہا جاتا ہے کہ مجلس تائون ساز میں پارٹیاں بنانا قطعاً ممنوع ہے اور دوسرے وقت میں اپنے ارکان کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ پارلیمنٹ میں اپنی پارٹی قائم کریں۔ ایک وقت میں کہا جاتا ہے کہ امیر جماعت کے مشورہ کا پابند نہیں۔ اُسے مشورہ کے خلاف "وٹو" کا حق حاصل ہے۔ اور دوسرے وقت میں صدارتی نظام کی اس بناء پر مخالفت کی جاتی ہے کہ اس میں صدر کو "وٹو" کا حق حاصل ہوتا ہے جو خلافت اسلام ہے۔ ایک وقت میں وکالت کے پیشے کو حرام قرار دیا جاتا ہے اور دوسرے وقت میں وکلاء کو امام ابو حنیفہؒ وغیرہ کے منصب وراثت ٹھہرایا جاتا ہے۔

یہ ہے نمونہ اس تعلیم کا جو ان سادہ لوح نوجوانوں کو دی جاتی ہے۔ آپ غور سے دیکھیں گے تو آپ کو صاف نظر آجائے گا کہ اس میں اور کیونسٹوں کے مسلک میں کوئی بھی تسبیح نہیں — فرق ہے تو بس اتنا کہ کسی مسلمان کیونسٹ کے دل میں ممکن ہے کبھی تنہائی میں یہ خیال اُبھر آئے کہ جھوٹ، فریب اور تضاد کی یہ روش صحیح نہیں ہے۔ لیکن جماعت اسلامی کے تربیت دادہ نوجوانوں کے دل میں اس قسم کا خیال کبھی نہیں اُبھر سکتا۔ کیونکہ انہیں اس کا یقین دلا دیا گیا ہے کہ یہ سب کچھ (معاذ اللہ) خدا اور رسولؐ کے احکام کے مطابق ہے اور اس پر عمل پیرا ہونا تو اب کاموجب۔

ان حالات کے پیش نظر آپ غور فرمائیے کہ مستقبل قریب میں اس ملک کا حشر کیا ہونے والا ہے؟ جیسا کہ میں بار بار اعلان کرتا چلا آ رہا ہوں، میرا تعلق نہ کسی مذہبی فرقہ سے ہے نہ کسی سیاسی پارٹی سے۔ میں نے ملی سیاسیات میں قدم ہی نہیں رکھا۔ میں نے تحریک پاکستان کی امکان بھرتائید کی تو اس یقین کی بنیادوں پر کہ اس سے ایک ایسا قطعہ زمین حاصل ہو جائے گا جس میں قرآنی نظام کے احیاء اور ممکن کا امکان ہوگا۔ یہاں آنے کے بعد میں گزشتہ اٹھائیس سال سے مسلسل ہن پکا رکھ رہا ہوں تو اس لئے کہ یہ میرے ایمان کا تقاضا ہے۔ میرے پاس وہ ساز و سامان نہیں جس سے میں اس دینی تقاضہ کو ملک کا عملی دستور اور نظام بنا دوں۔ جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا ہے، اُس مقصد کے حصول کے لئے، جس کی خاطر یہ ملک وجود میں لائی گئی تھی، صرف ایک طریقہ تھا اور وہ یہ کہ ہم اپنی آنے والی نسلوں کی تعلیم و تربیت کا ایسا انتظام کریں کہ قرآنی اقدار کی پابندی ان کی زندگی کا تقاضا بن جائے۔ ہم نے اس سے توفیق پزیر ہونا، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ہم اس مقام پر آکھڑے ہوئے ہیں جہاں قوم اپنے مستقبل کی طرف سے قاطعہ دایوس ہو رہی ہے۔ اور دایوس کا جو نتیجہ ہوا کرتا ہے ظاہر ہے۔ مقامِ تاسع یہ ہے کہ یہ احساسِ ندامت سیاست کے ذہنوں میں نظر آتا ہے اور نہ ہی اقامتِ دین کے دعووں

سے ان تمام امور کے حوالے طور پر اسلام میں پیش کئے جاتے رہتے ہیں۔



کے قلب میں — ان میں سے — ہرگز کو ہے تہہ معصوم کی تلاش۔

سرستید کے زمانے میں بھی قوم، تباہی کے اسی جہنم کے کنارے پہنچ چکی تھی، لیکن جب اس عسین بخت نے یہ سوچا کہ اس کا علاج تعلیم ہے، اور وہ اس تصور کو عملی پیکر عطا کرنے کے لئے اٹھا تو اس دور کی "غلامی" اس کے راستے میں مڑاؤ نہیں ہوتی۔ لیکن واسطے بر حال ما، کہ ہمارے دور آزادی میں اس کا بھی امکان نہیں رہا۔ اسکولوں اور کالجوں کی نشیلا یکساں اس کی بھی اجازت نہیں دیتی کہ کوئی شخص یا ادارہ، صحیح اسلامی تصور کی آئندہ درس گاہ قائم کر سکے جس میں محدود پیمانے پر ہی سی، اس بند نصب العین کو نوجوانوں کی زندگی کا نصب العین بنایا جاسکے، جسے قرآن نے منتخب کیا تھا اور جس کے حصول کے لئے یہ ملکیت وجود میں لائی گئی تھی۔ ایک ایسی درس گاہ کے قیام کی میری اسکیم بھی اسی گہر داب میں جھپکے لئے کھارہی ہے۔

یہ ہے عزیزان سن! اس خواب کی تعبیر جسے آج سے پینتالیس سال پہلے حکیم الامت کی نگہ جہاں میں نے دیکھی اور ہائی پاکستان کی فراست نے جہاں لو کی شکل میں پیش کیا تھا۔ اس خواب اور اس کی تعبیر کی طول و طویل داستان کو اقبالؒ نے ایک مصرعہ میں جس ايجاز و اعجاز سے سمودیا ہے، یقین مانئے کہ میں جوں جوں اس پر غور کرتا ہوں سوچوں سے سمندر میں ڈوب جاتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ اس داستان کے متعلق میں اس سے زیادہ اور کیا کہوں کہ تحریک زیادہ رفتہ و تعبیر آرزو است — میں ایک خواب دیکھا تھا جو کبھی بھول گیا لیکن میں ہر ایک سے پوچھتا پھرتا ہوں کہ اس کی تعبیر کیا ہے؟ ایک بھولے ہوئے خواب کی تعبیر کی آرزو، یہ ہے ہمارا حاصل حیات!

لیکن مجھے عزیزان من! نہ وہ خواب بھلا ہے۔ ہی میں اس کی تعبیر کی طرف سے بالوس ہوں۔ امید نہ تو وقت کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے، نہ ہی اسے پیمانہ امر و نہ فرد اسے مایا جاتا ہے۔ یہ تو زندگی کی جوڑے رواں کی طرح، جام و داں ہیسم دواں، ہر دم جواں رہتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ تو دائرہ فطرت نے انسانوں کی پیدائش کا سلسلہ بند کر دیا ہے نہ ہی قرآن کی نورافشاںیوں کا دور ختم ہو گیا ہے۔ اس لئے اگر آج کا انسان اس قدر اہمائی سے اپنی زندگی کے راستوں کو روشن نہیں کرنا چاہتا تو نہ ہی کل کو اسے دلسان انسان اسے دلیل راہ بنائیں گے۔ اس کتاب عظیم کو قیامت تک محفوظ رکھنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ کسی دور کا انسان بھی روشنی کی طرف سے بالوس نہ ہونے پائے۔ لہذا جب تک قرآن باقی ہے۔ (اور یہ ابد تک باقی رہے گا) اس وقت تک امید باقی ہے کہ کس قدر حسین اور شگفتہ انداز میں کہہ گیا ہے بات کہنے والا کہ

از صد سخن پریم، یک حرف مرآباد است عالم نشود ویراں، تا میکند آباد است

اور یہی وہ حرف دلاویز ہے جسے میں بھی دھرائے چلا جا رہا ہوں

قدم قدم پہ چلتا ہوں خیر دل کچھ چراغ یہ سوچ کر کوئی بھیچے بھی آ رہا ہو گا

قرآن کریم نے ایمان بالآخرت پر جو اس قدر زور دیا ہے تو اس سے مقصد یہی ہے کہ اگر آج کا دور تہا سے مقاصد کے سازگار نہیں تو بالوس نہ ہو۔ اپنی نگاہ مستقبل پر رکھو یہ مستقبل پیامان ہے، عزیزان من! جو مجھے کبھی بالوس نہیں ہونے دیتا۔ لہذا

تجویم بختے رہیں، تیرگی امنڈتی رہے مگر یقین سحر ہے جنہیں اداں نہیں

وَالسَّلَام

۱۔ اس اسکیم کے متعلق تفصیل سے کسی دوسرے وقت بیان کیا جائے گا۔ (طلويع اسلام ۱۹۶۹ء)